ہندوستاں ہمارا

بلونت سنگھ

پہلی اشاعت ..... ایک ہزار

ناشر

سنگم پبلشنگ ہاؤس۔ الہ آباد

جون ۱۹۴۷ء

پرنٹر

حکیم رمضان علی اسرار کریمی پریس

الٰہ آباد

فہرست

صفحہ

ہندوستاں ہمارا

ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
(اقبال)

جگجیت سنگھ اپنی بیوی کی تلاش میں تھا۔

بھلا اتنے بڑے جوڑ میلے میں ایک عورت کو ڈھونڈ نکالنا بھی کوئی آسان کام تھا۔ سکھوں کا جوڑ میلہ ایک برس میں ایک ہی مرتبہ لگتا تھا۔ گرو ارجن دیو جی مہاراج کی یاد میں بڑے بڑے دیوان لگتے۔ پنجاب کے دُور افتادہ مقامات سے پریمی سکھ جوق در جوق آتے۔ دو دن تو اُس جگہ تل پھینکنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے سبھی جمع ہوتے تھے۔ اتنی بھیڑ میں بھلا جگجیت سنگھ کی بیوی کا کیا پتہ چل سکتا تھا۔

لیکن وہ بیوی کو ڈھونڈے بغیر واپس نہ جا سکتا تھا۔ وہ کچھ عرصہ تک برما کے محاذ پر جانے والا تھا۔ اُس نے بمشکل دو ہفتے کی چھٹی حاصل کی تھی۔ وہ

چاہتا تھا کہ اِن چھٹیوں میں وہ اپنی بیوی کو ہمراہ لے کر شملے چلا جائے۔ اُس کی بیوی کی خواہش تھی کہ وہ کسی پہاڑی مقام کی سیر کرے۔ ہز میجسٹی کی فوج کا لفٹننٹ ہونے کی حیثیت سے نہ معلوم کتنے عرصہ تک اُسے اپنی قوم اور ملک کی خدمت کرنی پڑے ہندوستان کی خاکِ پاک کو لالچی اور خونخوار دشمنوں سے بچانے کے لئے نیز ہندوستان کی آزادی برقرار رکھنے کے لئے نہ معلوم کب تک اُسے شمشیر بکف رہنا پڑے۔ اِن حالات میں اُس نے مناسب سمجھا کہ چند روز اپنی بیوی کی صحبت میں کسی پر فضا مقام پر گزارے۔

وہ آج صبح ہی گھر پہنچا تھا۔ لیکن بیوی موجود نہ تھی صرف ماں بیٹھی چرخہ کات رہی تھی۔ گھر پہنچتے ہی اُس نے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ وہ منہ سے کچھ کہتے سے شرماتا تھا۔ شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ ماں بھانپ گئی۔ سوت کے ساتھ نئی پونی لگا کر بولی۔ "لڑکیاں جوڑ میلے پر گئی ہیں۔ میرا بھی جی چاہتا تھا۔ لیکن میلے کے دنوں میں گھر اکیلا چھوڑ کر جانا مناسب نہیں اس لئے میں نے آج اُنھیں بھیج دیا۔ کل میں خود جاؤں گی۔

پھر ماں نے بلائیں لے کر کہا "اچھا اب نہا دھو کر کچھ کھا پی لو۔"

"لیکن وہ کب آئیں گی ماں؟"

ماں ہنسنے لگی۔ "چھوکریاں ہیں کون کہہ سکتا ہے کہ کب آئیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ شام سے پہلے نہیں آئیں گی۔ آج دوپہر کا کھانا بھی وہ لنگر ہی سے کھائیں گی۔"

جگجیت سنگھ عجلت میں تھا۔ اُس نے ماں کو اپنا سارا پروگرام بتایا۔ ماں کہنے لگی اب وہ تیرے ساتھ پہاڑ پر نہیں جا سکتی۔

"نہیں جا سکتی؟ — کیوں؟"

"احمق!" اُس کی ماں پُرمعنی انداز میں ہنسنے لگی "کہہ جو دیا وہ نہیں جا سکتی"۔
وہ کچھ نہ سمجھا۔ لیکن وہ بلا کچھ کھائے پیئے بیوی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔
شادی ہوئے چار پانچ مہینے ہی گزرے تھے۔ شادی کے بعد وہ ایک ماہ کے قریب اپنی بیوی کے ساتھ رہا۔ پھر اُسے ملازمت پر جانا پڑا۔ اب یہی ایک موقع تھا۔ اِس کے بعد نہ معلوم کب ملاقات ہو یا نہ ہو۔ اُسے اپنی بیوی سے اتنی ہی محبت تھی جتنی کسی نوعمر جوشیلے نوجوان کو ہو سکتی ہے۔ اُسے اس کا خوبصورت تیکھے خد و خال والا چہرہ بخوبی یاد تھا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوگی وہ اُسے پہچان لے گا۔
بھیڑ میں سے رستہ بناتا ہوا وہ چلا جا رہا تھا۔ پہلے وہ خیموں کے عارضی بازار میں سے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتا ہوا گزر گیا۔ اُس کی بیوی چٹپٹی چیزیں کھانے کی بہت شوقین تھی۔ اُس نے دُور چاٹ والے کی دوکان پر چند عورتوں کا جمگھٹا دیکھا۔ وہ لپک کر وہاں پہنچا۔ عورتوں کی خاصی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ اِن میں اُس کی بیوی شامل ہو یا نہ ہو۔ اگر وہ یوں ہی نظر اُٹھا کر کسی غیر عورت کو دیکھ لے تو وہ ہاتھ دھو کر اُس کے پیچھے ہی پڑ جائے۔ چنانچہ وہ دو پیسے کے دہی بڑے لے کر ایک طرف کھڑا ہو گیا اور کنکھیوں سے عورتوں کا جائزہ لینے لگا۔ لیکن اُن میں اُس کی بیوی موجود نہ تھی۔ وہاں سے نکلا تو پرے تلی ہوئی مچھلی بیچنے والے کی دوکان نظر آئی۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کی بیوی مچھلی کے پکوڑے یا تلی ہوئی مچھلی بھی بڑی رغبت سے کھاتی تھی۔ ممکن ہے وہاں بینچ پر اُنگلیاں چاٹتی ہوئی سی سی کر رہی ہو۔ اُس کی بیوی ابھی نوعمر لڑکی ہی تھی۔ یہی سولہ سترہ کا سن تھا۔ بڑی چنچل اور طرحدار۔ اُسے دیکھ پائے گی تو بھلا وہ کس انداز سے مسکرانے لگے گی۔ وہ بھاگا بھاگا پہنچا۔ لیکن اُس کی بیوی اُس جگہ بھی موجود

نہ تھی۔ اسی طرح بھاگم بھاگ اس کی پگڑی بھی ڈھیلی ہو گئی۔ گردن کی جلد سرخ ہو گئی۔

بڑے گوردوارے کے اردگرد دُور تک علیحدہ علیحدہ شامیانوں کے نیچے دیوان لگے ہوئے تھے۔ ان دیوانوں میں مرد بھی شامل تھے عورتیں بھی۔ اُس نے سوچا ممکن ہے وہ کسی دیوان ہی میں بیٹھی ہو۔ وہ بھاگا بھاگا ایک ایک دیوان میں گھس گیا۔ اسٹیج پر نئی روشنی کا ایک سکھ جنٹلمین کھڑا ہوا تھا۔ وہ سکھ قوم کے کسی مسئلہ پر جدید روشنی میں بحث کر رہا تھا۔ وہ ایک چھوٹے قد کا مختصر سا آدمی تھا۔ اگرچہ وہ بڑے جوش میں بول رہا تھا۔ لیکن یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ دیہاتوں سے آئے ہوئے اکھڑ سکھ اُس کے لکچر میں خاص دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ اُس کی کمزور پتلی پتلی باہیں اور چھوٹی چھوٹی کسی ہوئی مٹھیاں، اُس کی باریک زنانہ آواز اور پھر اُس کی اُردو ملی پنجابی بولی یا پنجابی ملی اُردو سونے پر سہاگہ کا کام کر رہی تھی......

"میں آپ نوں یقین دلاتا ہاں۔ بلکہ ہم ایسی بات پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اسی یہ نتیجہ نکالن میں حق بجانب ہیں کہ سکھ قوم بڑی بہادر قوم تھی اور ہن بھی ہے۔ لیکن سکھ راج نیتی کے معاملے وچ کورے ہی ہیں۔ سیاست میں کوئی ٹاواں ٹاواں آدمی سمجھ دار بھی نظر آجاندا ہے پر اس بات کی پنتھ نوں ہمیشہ ہی کمی رہندی ہے.... جے آپ بگھیل سنگھ کی گل پر غور کرو۔ بگھیل سنگھ نے دلّی پر قبضہ کر لیتا۔ دلّی پر پنتھ کا نشان لہران لگ پیا۔ تو خالصہ صاحبو! دیوالی کے دن آگئے۔ سب سکھوں نے کہا کہ ایس دیوالی امرتسر مناونی ہے جی۔ اس گل نوں سن کر بگھیل سنگھ جی بولے "خالصہ جی کی بات ہم سویکار کرتے ہیں۔ ہن خالصہ جی امرت سر جی کی طرف کوچ کر دیو۔ اُس وقت

کسے نے کہیا "سردار صاحب! دلی دا کیا بنے گا؟" سردار گھیل سنگھ جی کہن لگے "او پھر فتح کر لیں گے" تو جی جیکارے بلاندے اوہ واپس امرت سر آن ڈھکے.........."

جگجیت سنگھ اُچک اُچک کر عورتوں کی طرف دیکھتا رہا۔ اُسے اپنی بیوی کہیں بھی نظر نہ آئی۔ بچارا بہت پریشان تھا وہاں سے ہٹ کر بھیڑ میں دھکے کھاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ کوئی عورت اُس کی نظر سے نہ بچتی تھی۔ وہ اور ایک دیوان میں جا نکلا۔ وہاں بھی لکچر ہو رہا تھا۔ یہ لکچر دینے والے سردار صاحب خوب لمبا سا لٹھ ہاتھ میں تھامے ہوئے تھے۔ وہ بڑے جوش میں بول رہے تھے۔ اُن کی آواز گرجدار تھی اور صورت سے رعب ٹپکتا تھا۔ اُس نے اپنے منہ کے دہانے کے آگے سے اپنی گھنی اور بڑی بڑی مونچھیں ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے کہا:—

"پنتھ جیو! مجھے ایک بڑے وِدوان پروفیسر نے یہ بات بتائی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ہندوستان کی ہسٹریاں لکھنے والے سب انگریز مصنف اِس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اِس زمانہ میں اُنھیں مشرق میں سب سے سخت دشمن سکھ ہی ملے تھے۔ یہ بات کٹر سے کٹر انگریز بھی تسلیم کرتے ہیں — آخر یہ جوش اور طاقت سکھوں میں کہاں سے آگئی؟ یہ شری گرو کلغی دھر کا بھرا ہوا جوش ہے اور یہ شری گرو ارجن دیو جی مہاراج کی قربانیوں کا نتیجہ ہے..... میں آپ کو ایک مزے کی بات سناتا ہوں" یہ کہہ کر وہ ذرا زور کے ساتھ کھانسا۔ جگجیت سنگھ عورتوں کے جھرمٹ کے قریب چلا گیا—" یہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ کی بات ہے۔ اِس وقت مہاراجہ جی کے جرنیل ہری سنگھ نلوے کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ یہ وہی نلوا تھا جس نے کابل قندھار تک سکھوں کی تلوار کا سکہ بٹھا دیا تھا—

پٹھان مائیں اپنے روتے ہوئے بچوں کو اُس کا نام لے کر چُپ کراتی تھیں۔ اُنہی دنوں کی بات ہے کہ انگریزوں نے کلکتہ میں ایک کانفرنس بلائی۔ اِس میں ہندوستان کے بڑے بڑے حکمراں یا اُن کے نمایندے بھی مدعو کئے گئے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ہری سنگھ نلوے کو روانہ کر دیا۔ جس دن پہلی میٹنگ ہونے والی تھی سردار ہری سنگھ نلوا وقت سے کچھ پہلے ہی وہاں جا کر بیٹھ گئے۔ ہری سنگھ بہت بھاری ڈیل ڈول والا شخص تھا۔ صورت ایسی ہیبت ناک اور پُرجلال تھی کہ دیکھ کر دل تھرا جاتا تھا۔ آنکھوں میں ایسی تیزی تھی کہ کوئی شخص اُس سے آنکھ نہیں ملا سکتا تھا۔ خیر! اِس میٹنگ میں بھی لوگ جمع ہونے شروع ہوئے۔ جو کوئی نلوے کو دیکھتا حیرت سے اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں۔ میٹنگ کی کارروائی کا وقت بھی آن پہنچا۔ لیکن حاضرین کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ ہری سنگھ نلوا کچھ دیر تک تو منتظر رہے پھر وہ کچھ بُرا مان گئے اور اُسی دن پنجاب کی طرف روانہ ہو پڑے اور لاہور پہنچ کر مہاراج سے اِس بات کی شکایت کی۔ مہاراج نے اُسی وقت انگریزوں کو چٹھی لکھی کہ آپ لوگوں نے ہمارے نمایندے کی تضحیک کی ہے۔ وہ آپ کی کانفرنس میں شامل ہوا اور سب چُپ چاپ بیٹھے رہے۔ اِس بات پر انگریزوں نے جواب دیا کہ ہم معافی کے خواستگار ہیں۔ لیکن ہم لاچار تھے آپ کے جرنیل کا دبدبہ ہی کچھ ایسا تھا کہ یہاں پر کسی کو زبان ہلانے کی جرأت تک نہ ہوئی۔ سب ممبران یہی سوچتے رہ گئے کہ ممکن ہے وہ کوئی بات کہیں جو نلوے کو پسند نہ آئے اور وہ خفا ہو جائے.... سو یہ تھا ہمارے جرنیل ہری....“

جگجیت سنگھ آگے بڑھ گیا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ اُس نے صبح سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ جلدی سے اپنی بیوی کو ڈھونڈ کر لے آئے گا۔ پھر وہ نہا دھو کر کھانا کھائے گا اور اُس کی بیوی بھی شام تک

تیاری کرے گی۔ اگر اس طرح ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہی شام ہوگئی تو وہ آج
نہ جا سکیں گے۔ جس کے معنی ہیں ایک دن ضایع ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ اور
بھی سرگرمی سے بیوی کی تلاش کرنے لگا۔ اُس کی پریشانی دیکھ کر کوئی سیوادار
پوچھ بیٹھتا "کیوں سردار جی! خیریت تو ہے۔ کوئی بچہ وچہ تو نہیں کھو گیا؟" وہ
مسکرا کر آگے بڑھ جاتا۔ واقعی اتنے بڑے میلے میں بیوی کو تلاش کرنا بہت مشکل تھا۔
پرے گھاس کے ٹکڑے پر درخت کی چھاؤں تلے رنگ برنگ کے کپڑوں
والی عورتیں بیٹھی تھیں۔ اُسے کچھ اس قسم کا دھوکا ہوا جیسے اُس کی بیوی بھی ان
میں شامل ہو۔ وہ بڑی امیدوں کے ساتھ وہاں پہنچا۔ لیکن مایوس آنا پڑا۔
کئی طرحدار بانکی عورتوں کو پیچھے سے دیکھ کر اُسے شک گزرتا ممکن ہے
یہ میری بیوی ہی ہو۔ مگر جب قریب پہنچ کر اُن کی طرف دیکھتا تو شرمندہ ہونا پڑتا۔
اِدھر وہ عورتیں اپنی خوبصورت آنکھیں ایک مرتبہ تو حیرت سے اُس کے چہرے پر
گاڑ دیتیں۔ پھر وہ جلدی سے منہ پھیر کر چل دیتیں۔
ایک اور بڑے مجمع میں بہت عورتیں بیٹھی دکھائی دیں۔ وہ خود لمبے قد کا شخص
تھا۔ لیکن اُس کے آگے کھڑے ہوئے طرّہ باز سکھ نوجوانوں کی پگڑیوں کے پھیلے
ہوئے کلغے اُس کے راستے میں حائل ہو جاتے تھے۔ وہ بھی مجمع میں گھس کر کھڑا
ہو گیا۔ یہاں ڈھڈ سارنگی والوں نے سماں باندھ رکھا تھا۔ ڈھڈ چھوٹی ڈھولک
سی ہوتی ہے جسے ایک ہاتھ میں پکڑ کر دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے اُسے بجایا
جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ستار بجتا ہے۔ یہ دونوں ساز رزمیہ اور جوشیلے گانوں
کے لئے مخصوص ہیں۔ سب سے زیادہ بھیڑ اسی جگہ تھی۔ عورتوں کی تعداد بھی بہت
زیادہ تھی۔ جگجیت سنگھ کو پورا یقین تھا کہ اُس کی بیوی اِس جگہ ضرور مل جائیگی۔
وہ کچھ آگے بڑھا پھر رُک گیا۔ اُس نے سوچا کہ اگر اس نے زیادہ دھما

چوکڑی مچائی تو لوگ اُسے نکال باہر کریں گے۔ وہ ایسے زاویہ پر کھڑا ہونا چاہتا تھا جہاں سے وہ عورتوں کو بخوبی دیکھ سکے۔ وہ کچھ دیر کے لئے ڈھڈ سارنگی والوں کے گیت سننے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

وہ تعداد میں تین تھے۔ تینوں شخص خوب پلے ہوئے بھینسوں کی طرح موٹے تازے تھے۔ رنگ تانبے کے مانند سُرخ۔ گردن کی رگیں پھولی ہوئیں۔ جوش میں بھرے ہوئے شیروں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ اس وقت وہ مشہور شاعر شاہ محمد کی لکھی ہوئی رزمیہ نظم سنا رہے تھے۔ اس نظم میں شاہ محمد نے بڑے پر جوش انداز میں سکھوں اور انگریزوں کی لڑائی کا حال بیان کیا ہے۔

ان تین اشخاص میں سے ایک کے ہاتھ میں ستار تھا اور دو کے ہاتھوں میں ڈھڈ۔ ڈھڈ کی دھپا دھپ کی آواز کے ساتھ اُن کے ہاتھ اور سر بھی ہل رہے تھے حاضرین بیٹھے جھوم رہے تھے۔ ڈھڈ والوں میں ایک شخص کبھی نثر میں جنگ کا نقشہ کھینچتا اور پھر کوئی بول وہ تینوں ہم آواز ہو کر ایک ساتھ پر جوش انداز میں گانے لگتے

"صاحبان! یہ ایک غلط بات ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد سکھوں نے جنگ کا آغاز کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ خود انگریزوں کی نیت خراب تھی اُنھوں نے رشوت دے کر چند سکھ سرداروں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا مجبوراً سکھوں کو بھی لڑنا پڑا۔ یہ انگریزوں کی خوش قسمتی تھی کہ اس وقت سکھوں کا کوئی رہنما نہ تھا۔ اگر یہ لڑائی مہاراجہ شیر پنجاب کی زندگی میں شروع ہو گئی ہوتی تو یقیناً آج ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی۔ ایک طرف فرنگیوں نے کچھ ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ سکھوں کے لئے جنگ ناگزیر ہو گئی۔ اور جب سکھ مرنے مارنے پر تیار ہو گئے تو انگریزوں نے چاہا کہ طوفان ختم ہو جائے۔ چنانچہ شاہ محمد فرماتے ہیں۔

چٹھی لکھی فرنگیاں خالصے نوں

لشی کاس نوں جنگ مچا لو ویں او۔
(انگریزوں نے سکھوں کو چٹھی لکھی کہ آپ جنگ کیوں چھیڑ رہے ہیں)
کئی لکھ روپیہ لے جاؤ ساتھوں۔
ہور دسیے جو تس فرماندے او۔
(ہم سے لاکھوں روپیہ لے جاؤ اور اس کے علاوہ جو کچھ آپ طلب کریں ہم دینے کو تیار ہیں)

جگجیت سنگھ مایوس ہو کر مجمع سے باہر نکل آیا۔ اب کوئی چارہ باقی نہ رہا تھا اُس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ پسینہ اِس قدر زیادہ آیا تھا کہ اس کی بغلوں میں اُس کا خاکی کوٹ تک بھیگ گیا تھا۔ پیٹ پیٹھ سے جا لگا تھا۔ شدت کی پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اُسے اپنی بیوی پر سخت غصہ آنے لگا۔ نہ معلوم کمبخت کہاں چھپ کر بیٹھ رہی ہے۔ اُس کا سارا پروگرام درہم برہم ہوا جا رہا تھا۔ اُس نے سبیل سے دودھ کی کچی لسی پی اور لاہور کے قلعہ کی دیوار سے پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں۔ وہ زیادہ دیر تک کھڑا نہ رہ سکا۔ اس قدر شور و غل اور دھکم دھکے میں وہ بھوکا پیاسا صبح سے گھوم رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ کہیں لیٹ کر کمر سیدھی کر لے۔

یہ سوچ کر وہ میلے سے ذرا ہٹ کر ایک درخت کی طرف بڑھا۔ برگد کے پھیلے ہوئے درخت کے نیچے۔ گاؤں سے آئی ہوئی عورتیں بیل گاڑیوں کے نیچے بیٹھی روٹیاں کھا رہی تھیں۔ وہ مایوس تھکا ہارا قدم بڑھائے چلا جا رہا تھا کہ اتنے میں ایک لڑکی بھاگتی ہوئی اُس کے سامنے آن کھڑی ہوئی......
اُس نے آنکھیں اُٹھائیں..... ارے اُس کی چھوٹی بہن!..." ستو! ستو! تم لوگوں کو صبح سے ڈھونڈ رہا ہوں۔ کہاں بیٹھی ہو تم لوگ؟"

بہن نے انگلی سے دُور اشارہ کیا۔ وہ اُس کے ساتھ چل دیا اور وہاں اُس کی دوسری بہن اور بیوی صاحبہ بھی براجمان تھیں۔ بیوی حسبِ معمول چٹوری بلّی کی طرح اپنے سامنے کئی چٹپٹی چیزیں رکھے پوریاں کھانے میں مصروف تھی۔

دونوں کی نظریں ملیں تو بیوی دلفریب انداز سے مسکرا کر شرما گئی۔ کتنی محنت کے بعد بیوی کی صورت نظر آئی تھی۔ وہ پہلے کی طرح سانولی سلونی ہی تھی۔ سرخ رنگ کی شلوار اور تنگ سی قمیص پہنے ہوئے جس میں اُس کی چھاتیوں کی اُبھری ہوئی گولائیاں صاف نظر آتی تھیں۔ اُس کا جسم پہلے ہی کی طرح جاذب تھا۔

جگجیت سنگھ اُن کے پاس بیٹھ گیا اور دو تین پوریاں بھی کھالیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنا رونا بھی روتا گیا۔ بیوی بولی "آخر میں کہیں گم تو نہ ہوجاتی آپ گھر ہی پر کیوں نہ بیٹھے رہے..... اس قدر دھوپ میں..... خواہ مخواہ....."

اُس نے بہنوں کی نظریں بچا کر اُس کی بغل میں چٹکی لے لی اور وہ بل کھا کر پرے سرک گئی۔ پھر اُس نے بتایا کہ آج وہ دونوں شملہ کو جانے والے تھے۔

اُس کی بیوی حیران رہ گئی۔ اُس کے منہ کا نوالہ منہ ہی میں رہ گیا حلق سے اترا ہی نہیں۔ بڑی خوش ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کی بیوی کتنی خوش ہوگی۔

وہ لوگ جلدی سے میلے کو خیر باد کہہ کر گھر آئے۔ آتے ہی اُس کی بیوی نے سامان باندھنا شروع کردیا۔ ماں نے کہا۔ وہ تیرے ساتھ کیسے جاسکتی ہے۔ ایک تو تم احمق ہو اور تم سے زیادہ وہ احمق ہے جو جھٹ تمہارے ساتھ چلنے پر آمادہ ہوگئی۔

ادھر اُس کی بہنیں بھی واویلا کرنے لگیں کہ وہ بھی چلیں گی۔ بہنیں تو بھابی کو بھی نہ جانے دیں گی۔ یہ نیا جھنجھٹ آن پڑا۔ اُس نے ماں سے کہا "آخر ہرج ہی کیا ہے۔ پہاڑ پر چلی جائے گی تو اُس کی صحت اور اچھی ہو جائیگی۔"

اِس پر اس کی ماں نے ناک چڑھا کر کہا "باگھورو، باگھورو، لفنٹ ننٹ بن گیا ہے پر اتنی عقل بھی نہیں سر میں....."

پھر وہ اُسے گھر کے ایک کونے میں لے گئی اور اُس کے کان میں کھسر پھسر کرنے لگی۔ جگجیت سنگھ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اُس کے منہ سے مسرت کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اُس کی بیوی حاملہ تھی۔ اُس نے ماں کو بازوؤں میں جکڑ کر اوپر اُٹھا لیا "اوہ میری اچھی ماں.... میری بہت ہی اچھی ماں...... بول تو کس چیز سے منہ میٹھا کرے گی۔

ماں خوشی سے پھول کر کپّا ہو گئی بولی "ارے پگلے! منہ تو میٹھا کر ہی لوں گی تو یہ بتا کہ میرا مطلب بھی سمجھ گیا کہ میں کیوں تجھے اُسے ساتھ لے جانے سے منع کرتی تھی۔"

"لیکن ماں اس سے کیا ہوتا ہے وہ چلے گی میرے ساتھ، اچھا ہوا جو تو نے بتا دیا۔ میں اس کا سب خیال رکھوں گا..... میں سب کچھ سمجھتا ہوں۔"

ماں بگڑ گئی "پھر وہی مرنے کی ایک ٹانگ۔ جب میں نے کہہ دیا نہیں جائیگی۔"

"کیوں ماں! کیوں نہیں جائے گی؟"

"نہیں جائے گی ہزار بار لاکھ بار کہہ دیا نہیں جائے گی۔"

یہ نئی مشکل آن پڑی۔ اُس نے منت کر کے کہا۔ "ماں آخر تجھے ہو کیا گیا ہے؟"

"ارے جاہل، ہوش کی دوا لے۔ عورت کے پیٹ میں بچہ ہو اور پہاڑ پر۔"

قلانچیں بھرتی پھرے۔ تیری عقل گھاس چرنے گئی ہے کیا؟"

وہ آگے بڑھ کر ماں کو سمجھانے لگا" ماں! دھیرج کر کے میری بات بھی تو سُن...... تین چار مہینے کا بچہ تو ہے ہی اس میں پریشانی کی بات کیا ہے؟"

اِس پر ماں جھنجھلا کر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اُس نے اُس کا منہ بند کر کے کہا "میری بات تو سُن لے پہلے مجھے یہ بتا کہ تو بہار کو سمجھتی کیا ہے۔ وہاں ہموار سڑکیں ہوتیں ہیں۔ پھر ہر قسم کی سواری مثلاً رکشا ڈانڈی وغیرہ۔ بھلا میں اُسے پیدل گھماؤں گا۔ تو نے بھی مجھے ایسا ہی بے وقوف سمجھا ہے۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر دس قدم بھی جانا ہو گا تو میں اُسے رکشا پر بٹھا کر لے جاؤں گا۔"

اَن پڑھ ماں نے روہانی آواز میں کہا "ارے بیٹا رکشا کیا ہوتی ہے میں نے تو آج ہی نام سُنا ہے۔ کیوں بناتا ہے مجھے......"

جگجیت سنگھ نے ماں کو سمجھانے میں اپنی ساری قابلیت صرف کر دی۔ ماں بڑی مشکل سے رضامند تو ہو گئی لیکن اُس کے دماغ میں اب بھی یہی خیال بیٹھا ہوا تھا کہ بیٹا غلطی کر رہا ہے۔ ماں سے جان چھوٹی اور سامان بندھنے لگا تو بہنیں بسورنے لگیں۔ آج اُسے بہنوں پر بڑا غصہ آ رہا تھا۔ اُنھیں اتنی تعلیم بھی نہیں دی گئی کہ اگر میاں بیوی کسی جگہ تفریح کے لئے جا رہے ہوں تو دوسروں کو خواہ مخواہ اُس میں اپنی ٹانگ نہ اڑانی چاہیے۔

وہ بہنوں کو کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ لیکن اس موقع پر اُس کی ماں نے دونوں لڑکیوں کو جھاڑ کر بٹھا دیا "خبردار! چوٹی کاٹ کر پھینک دوں گی اگر تم میں سے کسی نے ساتھ جانے کا نام بھی لیا تو۔"

اب بہنیں بھائی کی طرف دیکھنے لگیں۔ بھائی نے سر اور آنکھوں کے اشارے سے ظاہر کیا کہ اب وہ کیا کر سکتا تھا۔

بچاری سیدھی سادی بہنیں سمجھتی رہیں کہ بھیا بچارا تو انھیں لے جانے کے لئے تیار تھا۔ ماں نے نہیں جانے دیا۔

اِن سب باتوں سے فراغت پاکر اُس نے گھڑی دیکھی تو چار بجے تھے۔ ساڑھے آٹھ بجے گاڑی روانہ ہوتی تھی۔ ابھی کافی وقت باقی تھا۔ لیکن وہ دل میں ڈر رہا تھا کہ کہیں کوئی نئی رکاوٹ کھڑی نہ ہو جائے۔ اِس لئے اُس نے نوکر کو اُسی وقت تانگہ لانے کے لئے بھیج دیا۔ ماں کہنے لگی "بیٹا ایسی بھی کیا جلدی ہے"!

اُس نے بہانہ کیا کہ گاڑی میں بہت تھوڑا وقت باقی رہ گیا ہے۔ تانگہ آیا اور وہ جلدی سے سامان رکھ کر تانگے میں بیٹھ گئے۔ ماں نے بلائیں لیں دونوں کو تانگہ چل دینے پر بھی پکار پکار کر قیمتی نصیحتیں کرتی رہی۔

جب گھر سے دُور چلے آئے تو وہ ہاتھ جھاڑ کر کہنے لگا "بھئی شکر ہے ہزار ہزار جان چھوٹ ہی گئی۔

اُس کی بیوی ہنس کر اُس کے قریب ہو گئی اُس نے بیوی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ اچھا اب تم بھی مجھ سے باتیں چھپانے لگیں"؟

"میں نے کیا بات چھپائی"؟ اُس کی بیوی لاعلمی میں آنکھیں جھپکا کر بولی۔

جگجیت سنگھ نے پیٹ کی طرف آنکھ سے اشارہ کیا اور وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر روٹھ گئی۔ "آپ بہت بے شرم ہیں اور نہیں تو"!

"ہو ہو" جگجیت سنگھ نے کہا۔ "تم روٹھ گئیں۔ بھئی تمھیں منا لینا کیا مشکل ہے۔ ابھی دو پیسے کے گول گپے کھلا دوں تو خوش ہو جاؤ گی"!

اِس پر اُس کی بیوی انگلیوں کے بیچ میں سے دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگی۔

"اچھا واقعی بتاؤ تو کیا کھاؤ گی؟ دہی بڑے، پکوڑے، کلفی، رس گلے — آئس کریم...... بتاؤ میری چھوری بلی"!

"کھانے بیٹھ جائیں گے تو گاڑی جو چل دے گی"

"ہاہا..... آگئیں چکمے میں..... بھئی ابھی تو بہت وقت پڑا ہے۔ میں نے یونہی غپ اُڑا دی تھی۔ سوچا ذرا ان لوگوں سے جان چھڑا کر بھاگیں"

وہ دونوں ایک بہت بڑے ہوٹل میں گھس گئے۔ وہ جان بوجھ کر بیوی کو اُس ہوٹل میں لے گیا تھا۔ اب وہ لفٹننٹ ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا ذرا بیوی بھی اُس کی شان دیکھ لے۔ وہ ایک علیحدہ باکس میں بیٹھ گئے۔ اُس کی بیوی کے تروتازہ حسین چہرے پر حیرت کے آثار کس قدر بھلے معلوم ہوتے تھے۔ پہلے بھی اُس نے ہوٹلوں میں کھانا کھایا تھا۔ لیکن ایسے شاندار ہوٹل میں آنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔

جگجیت سنگھ نے بٹن دبایا گھنٹی بجی۔ بیرا حاضر ہوا۔ اُس نے آرڈر دیا۔

آج وہ بہت خوش تھا۔ اپنی محبوب بیوی کے ساتھ نہ پہلے کبھی اکیلے سفر کیا تھا نہ وہ کبھی اکیلے کسی مقام پر جا کر رہے تھے۔ پھر شملہ جیسے مقام پہ وہ دونوں کس قدر لطف اندوز ہوں گے۔

موجودہ لمحہ سے لیکر مکمل دو ہفتوں کی چھٹیاں ختم ہونے تک وہ ایک ایک لمحہ مسرت اور شادمانی میں گزارنا چاہتا تھا۔ آج صبح سے وہ عجب سراسیمگی میں گھومتا رہا۔ وہ سمجھنے لگا کہ یہ بھی واہگورو اکال پرکھ کی کرپا تھی کہ اُس کی سب مشکلات آنکھ جھپکتے میں دُور ہو گئیں۔

کھانا آیا اور وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ اُس کی بیوی کی شیریں آواز اُس کے کانوں میں امرت ٹپکاتی تھی۔ وہ بھی تو از حد خوش تھی۔ مینا کی طرح چہک چہک کر باتیں کر رہی تھی اُس کی طفلانہ حرکتیں اور بھی زیادہ مزا دے رہی تھیں۔

وہ بولی "کیوں جی! ہم گوردوارے میں ٹھہریں گے جا کر؟"

"نہیں مائی ڈارلنگ۔ ہم کسی شاندار ہوٹل میں ٹھہریں گے۔ گوردوارے کا

ناجائز فائدہ نہیں اُٹھانا چاہئے۔ گوردوارے پر بوجھ ڈالنے کی بجائے ہمیں اپنے ہاتھ سے وہاں دان کرنا چاہئے۔

پھر اُس نے بیوی کو پہاڑی مقامات کی بابت سب باتیں بتائیں۔" وہاں مکانات اوپر تلے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب بارش ہوتی ہے تو وہاں ہمارے شہروں کی طرح کیچڑ نہیں ہوتی بلکہ پانی فوراً بہ جاتا ہے۔ سڑکیں دھل کر صاف ہو جاتی ہیں..... وہاں ہم زمین سے بہت اونچے ہو جائیں گے سبھی..... یہ بادل جو آسمان پر نظر آتے ہیں ہمارے نیچے نظر آنے لگیں گے..... ہاں"

اُس کی بیوی یہ باتیں سن کر بہت حیران ہوئی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں خوش خوش باتیں کرتے ہوئے اسٹیشن کی طرف چل دیئے۔ تانگے سے سامان اتر کر قلیوں کے حوالے کیا۔ ابھی گاڑی جانے میں آدھ گھنٹہ باقی تھا اُس نے سکنڈ کلاس کے دو ٹکٹ خرید لئے۔

جنگ کی وجہ سے بھیڑ بھاڑ بہت زیادہ تھی اس لئے وہ دونوں فوراً پلیٹ فارم کی طرف چل دیئے۔ بیوی شوہر کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ اُس کا طاقتور اور چوڑے چکلے جسم والا خاوند اُس کی رہنمائی کر رہا تھا۔ گاڑی ٹھسا ٹھس بھری ہوئی تھی۔ سکنڈ کلاس کے صرف ایک ڈبہ میں ایک انگریز کے سوا اور کوئی نظر نہ آتا تھا۔

جگجیت سنگھ دروازہ کھول کر اندر جانے لگا تو انگریز اُٹھ کر دروازے پر آن کھڑا ہوا۔ "کسی اور ڈبے میں بیٹھئے جا کر!"

وہ بہت حیران ہوا۔ " اور کوئی ڈبہ خالی نہیں ہے "

" خیر اس ڈبے میں نہیں بیٹھنے دوں گا "

" کیوں، کیا یہ ریزرو ہو چکا ہے ؟"

انگریز نے نتھنے پھلا کر کہا " ریزرو ہی سمجھ لو "
جگجیت سنگھ بہت پریشان ہوا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا، کہیں بھی ریزرو لکھا ہوا نظر نہ آیا۔" یہ ریزرو نہیں ہے " یہ کہہ کر وہ اندر داخل ہونے لگا۔ تو صاحب نے پھر راستہ روک دیا۔ اِس بات پر کچھ تو تو میں میں ہو گئی۔ کچھ لوگ بھی جمع ہو گئے۔ اسٹیشن کا بابو بھی آنکلا۔ جگجیت سنگھ نے بابو کو ساری بات سمجھائی۔ صاحب نے چلا کر کہا " میں اِسے اپنے ڈبے میں سفر کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا "
بابو نے کہا اسٹیشن ماسٹر سے کہئے۔ جگجیت سنگھ اسٹیشن ماسٹر کے پاس گیا۔ اُس نے آکر صاحب کو سمجھایا لیکن صاحب نے سَو سوالوں کا جواب ایک " نہیں " میں دے دیا۔ پولیس کے کانسٹبل چپ چاپ اِدھر اُدھر کھسک گئے۔
اسٹیشن ماسٹر نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو فون کیا۔ وہ دفتر میں نہیں تھا اُس نے بھی لاچاری ظاہر کی آخر ہو بھی کیا سکتا تھا۔
گاڑی چلنے میں پانچ منٹ ہی باقی رہ گئے تھے جگجیت سنگھ پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ قلی سامان زمین پر رکھے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ اُس کی سرمگیں آنکھوں والی بیوی سراسیمگی سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ صاحب کھڑکی کے قریب بیٹھا اطمینان سے چرٹ پی رہا تھا۔
مادرِ وطن کے سینے پر مادرِ وطن کی ریل گاڑی کھڑی تھی اور مادرِ وطن کے ایک بیٹے کو اُس سرزمین سے ہزارہا میل پر رہنے والا اجنبی گاڑی کے اندر داخل نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس کا یہ جائز حق کوئی قانون واپس نہ دلا سکتا تھا۔ جگجیت سنگھ کا جسم تنگ وردی میں جکڑن سی محسوس کرنے لگا...... دفعتہً اُس نے قلیوں کو سامان اُٹھانے کے لئے کہا اور بیوی کو ساتھ لے کر گاڑی کے اُسی ڈبے کی طرف بڑھا۔ پیشتر اس کے کہ صاحب اُٹھ کر اُس کا راستہ روکے وہ پھرتی سے دروازہ کھول کر

اندر داخل ہو گیا۔ صاحب کی گردن پکڑی اور اُس کی ٹانگوں میں ہاتھ دیا اور اُچھال کر پلیٹ فارم پر پھینک دیا۔ بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اُسے سیٹ پر بٹھایا۔ قلی سامان لیکر اندر آ گئے اور اُس نے صاحب کا سامان اُٹھا اُٹھا کر پلیٹ فارم پر پھینکنا شروع کر دیا۔

صاحب گاڑی کی طرف لپکا۔ جگجیت سنگھ نے گاڑی سے نیچے اُتر کر اُسے راستہ ہی میں جا لیا۔ اُس کے گندم گوں ہاتھوں کی گرفت میں صاحب کی ٹائی آ گئی اور دوسرے فولادی ہاتھوں کے دو زنّاٹے کے تھپڑ اُس کے منہ پر پڑے۔ صاحب کی بتیسی ہل گئی اور اُسے دن میں تارے نظر آنے لگے۔ وہ تھپّڑ کھا کر لڑکھڑاتا ہوا پیچھے کی طرف اپنے کھلے سوٹ کیس میں جا دھنسا........ اِس کشمکش میں اُس کے سر سے ہیٹ گر کر جو لڑھکا تو ایک بازاری کتا اُسے منہ میں داب کر لے بھاگا۔

اِس کے بعد صاحب کو آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ جونہی جگجیت سنگھ نے پائیدان پر پاؤں رکھا۔ گاڑی چل دی۔

پتھر کے دیوتا

ستمبر کی ایک خوشگوار شام کو وہ گھر سے باہر نکل گیا۔
شام خوشگوار تھی۔ لیکن اُس کا دل اُداس تھا۔ اُداس بھی کیا بہت ملول تھا۔ وہ اِس وقت ساری دُنیا سے روٹھا ہوا تھا۔ جیسا سبھی کے ساتھ ہوتا ہے کہ بعض اوقات دِل اس دنیا سے اُکتا جاتا ہے۔ ہر شے بیکار، بے معنی اور خنک نظر آنے لگتی ہے۔ زندگی اس قابل معلوم ہی نہیں ہوتی کہ اُسے بسر کیا جائے۔ اس وقت انسان زندگی، زندگی کے مسائل یا دنیا کی ناپائیداری کی بابت سوچنے میں مصروف نہیں ہوتا۔ بلکہ یونہی ایک تھکن سی، یا کوئی تاریک بادل سا روح پر چھا جاتا ہے۔ نہ کسی بات پر حیرت ہوتی ہے نہ کسی بات پر شرم محسوس ہوتی ہے نہ کسی چیز پر فخر کرنے کو جی چاہتا ہے۔ نہ بیٹھا جاتا ہے نہ چلا جاتا ہے۔ نہ رُکا جاتا ہے۔ اس وقت یہی جی چاہتا ہے کہ انسان پٹاخے کی طرح پھٹ کر فضا میں غائب ہو جائے۔ بڑے آرام سے کوئی تکلیف محسوس نہ ہو۔ انسان سو بھی تو جاتا ہے۔ کسی شخص کو مرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو دل پر خوف طاری ہونے لگتا ہے۔ لیکن جب انسان سو جاتا ہے اُس وقت بھی تو آدھا مرا ہی سا دکھائی دیتا ہے۔ کم از کم انسان

کو اپنے اِرد گرد کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ نہ وہ سُنتا ہے۔ نہ دیکھتا ہے نہ بولتا ہے۔ بس اِس حالت سے ایک ہی قدم اور آگے بڑھ جائے تو اگلے جہان میں پہنچ جائے۔

کئی دنوں سے اُس کی یہی کیفیت تھی۔ اور پھر اِس کیفیت میں اگر واقعی کسی تکلیف دہ بات کا اضافہ بھی ہو جائے تو پھر انسان کی حالت مکمل طور پر خراب ہو جاتی ہے۔ یہی اُس کا حال تھا ـــــ وہ ہر شے سے بے خبر آگے بڑھا جا رہا تھا لیکن جب منزلِ مقصود سامنے نہ ہو تو پھر قدم بھی عجیب بے ڈھنگے طور پر اُٹھتے ہیں۔ وہ اپنے قدموں کے بے ڈھنگے پن سے بے خبر چلا جا رہا تھا۔

کہتے ہیں وینس خوبصورت شہر ہے۔ ضرور ہو گا۔ خشکی پر رہنے والوں کیلئے یہ حقیقت ازبس خیال انگیز ہے کہ وینس کی گلیوں اور بازاروں میں پانی ہی پانی ہے وہ لوگ ہماری طرح گھر سے نکلتے ہیں تو خشکی پر نہیں چلتے۔ بلکہ وہاں ہر گھر کے آگے دو تین چھوٹے ڈونگے بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب گھر کے کسی فرد کو باہر کسی کام سے جانا ہوتا ہے وہ اپنے دروازے ہی سے ڈونگے پر بیٹھ جاتا ہے اور اُسے کھیتا ہوا منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ ایسے شہر کی خوبصورتی سے کسی کو انکار کب ہو سکتا ہے۔ لیکن ناسک بھی کچھ کم خوبصورت شہر نہ تھا اگرچہ اُس کی خوبصورتی کسی اور پہلو سے تھی ـ یہ شہر نہ چھوٹا نہ بڑا۔ صاف ستھری گلیاں، خوبصورت لال پیلی عمارتیں۔ نواح میں ہر طرف ہرے بھرے کھیت اور چھوٹی چھوٹی بہت ہی حسین پہاڑیاں اور پھر شہر کے بیچوں بیچ گوداوری ندی۔ شاید دنیا میں اور شہر بھی ہوں۔ لیکن جس طرح گوداوری ندی اس شہر میں بہتی تھی وہ کچھ اسی کا حصّہ تھا۔ دوسرے شہروں کے دریا۔ مثلاً سری نگر کا جہلم شہر میں سے ہو کر بہتے ہوئے بھی شہر والوں سے کچھ تعلق نہیں پیدا کرتا۔

وہ ان سے علیحدہ رہتا ہے۔ وہ اپنے کناروں پر بنے ہوئے مکانات کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا۔ لیکن گوداوری ندی میں یہ بات نہ تھی۔ وہ شہر کی عمارتوں اور عمارتوں کے دروازوں اور دروازوں کے آگے بنے ہوئے چبوتروں سے کچھ اس طرح گھل مل گئی تھی کہ وہ بھی شہر کا ایک حصّہ ہو کر رہ گئی تھی۔ کبھی برسات میں یہ چھوٹی سی ندی بھی کسی چڑھتی آندھی کی طرح بال بکھرالیتی تھی۔ ورنہ عام طور پر وہ غضب میں کبھی نہ آتی تھی۔ شہر کے لڑکے بالے اُس کی گود میں کھیلتے پھرتے تھے۔ اس کا پانی گہرا اور خوفناک نہ تھا۔ بلکہ اُتھلا، سرد اور دلکش تھا۔ اِس ندی کے درشن کر کے شہر کے لوگوں کی طبیعت ایک مرتبہ تو جھوم اُٹھتی تھی .... خود اُسی پر یہ ردِّعمل ہوا کرتا تھا۔ لیکن آج جب وہ ندی کے کنارے پر ایک چٹان سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوا تو وہ ندی کی طرف ایسی کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے وہ اُسے پہچانتا ہی نہ ہو۔ یہ کتنی بُری بات ہے کہ انسان جس شخص کو اچھی طرح جانتا پہچانتا ہو اُس کی طرف کبھی ایسی نظروں سے دیکھنے لگے جیسے وہ اُس کے لئے پردیسی ہو۔ شہر کے لوگوں کی اس مانوس ندی کو اُس نے کئی مرتبہ ہمراز بنایا تھا۔ وہ کئی مرتبہ اُس کے صاف اور شفاف پانی کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا اور اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ بھی اکثر اسی طرح مسکرائی تھی۔ یہ تو محض انسان کی حماقت تھی کہ اُس نے بیجان چیزوں سے ہر قسم کا ناتا توڑ لیا تھا۔ جنگل میں، کھلے ہوئے پھولوں سے، چراگاہوں میں اُگی ہوئی گھاس سے، ڈھلواں زمینوں پر کھڑے ہوئے درختوں سے، برف کے تاج پہنے ہوئے پہاڑوں سے، چٹانوں کی دراڑوں میں سے پھوٹتے ہوئے سوتوں سے، نشیب و فراز پر چمکتی ہوئی دھوپ سے، ویران جگہوں میں آوارہ پھرتی ہوئی عجیب سی خوشبو سے .... یہ سب چیزیں انسان سے باتیں

کرتی ہیں۔ اگر اُن کی طرف رجوع کیا جائے تو وہ مسکراتی ہیں۔ شرارتیں کرتی ہیں، روٹھتی ہیں، بسورتی ہیں اور دوستی اور رفاقت کا دم بھرتی ہیں۔ ان کی قربت میں کیسا دائمی سرور محسوس ہوتا ہے۔ وہ صرف محسوس کرنے والی چیزیں ہیں۔ الفاظ اس قدر کثیف ہیں کہ ان کی لطافت کو بیان کر ہی نہیں سکتے .... ان سب چیزوں کو چھوڑ کر انسان کیا لے بیٹھا۔ معاشیات، سیاسیات، نفسیات، نہ معلوم کیا الم غلم۔ یوں انسان کا جی چاہے تو کسی قسم کی بھی زنجیروں میں اپنے ہاتھ پاؤں جکڑ کر خود اپنی زندگی مصیبت میں ڈالے اُسے کون منع کر سکتا ہے۔ لیکن زندگی کے اصول چند ہی ہیں۔ انسان کی بنیادی ضرورتیں انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں۔ انسان کے لئے دنیا کے کھیتوں میں کھانے کے لئے ضرورت سے زیادہ اناج پیدا ہوتا ہے۔ اور اگر اُسے تن ڈھانکنے کی واقعی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو اس کی بھی کوئی کمی نہیں۔ دور دراز علاقوں میں پہاڑیاں چنچل چھوکریوں کی طرح پنجوں کے بل کھڑی انسان کی راہ تک رہی ہیں۔ درخت، دریا، پہاڑ، کھلی ہوا، وسعت، لامحدود مسرت، مکمل اطمینان یہ سب انسانوں ہی کے منتظر ہیں۔ لیکن انسان ضدی اور لڑاکا بچوں کی طرح یونہی لٹوؤں پر ایک دوسرے کے ساتھ سر پھٹول کر رہے ہیں۔ کپڑے کی گڑیوں کے لئے ایک دوسرے کی بوٹیاں نوچے ڈالتے ہیں۔ بھدی آواز سے بجنے والے جھنجھنوں کے لئے ایک دوسرے کے ٹیٹوے دبا رہے ہیں۔ خود اُس نے ان حقائق کو محسوس کیا تھا۔ وہ گھنٹوں اس ندی کے کنارے بیٹھا رہتا تھا۔ وہ پانی کی طرف تاکتا رہتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پانی میں بھی زندگی کی تڑپ ہے۔ وہ بھی محسوس کرتا ہے۔ وہ خوش بھی ہوتا ہے۔ ہنستا ہے۔ بلکتا ہے......... اگر انسان بہت دیر تک ان سے لو لگائے

رکھے تو اُسے ایک جہان نظر آنے لگتا ہے۔ محبت، یکجہتی، یگانگت کی نئی پریت لڑی دکھائی دیتی ہے جس میں ہر شئے پروئی نظر آنے لگتی ہے۔ اِس رشتے سے کوئی چیز غیر یا اجنبی دکھائی نہیں دیتی۔ سب کا کوئی ایک ہی رکھوالا نظر آنے لگتا ہے۔ جو صبحِ ازل سے قدم اُٹھاتا ہوا اِس دھرتی اور بیشمار دھرتیوں پر چل رہا ہے۔ اِس قسم کی باتیں سوچتے سوچتے اُسے سوامی رام تیرتھ کا خیال آجاتا ہے۔ لوگ اُس کی موت کو ایک راز سمجھتے ہیں۔ لیکن سمجھنے والوں کے لئے اُس کی موت کس قدر کھلی ہوئی حقیقت ہے۔

شام کے وقت ندی پر سیر کرنے والوں کے گروہ اِدھر اُدھر گشت کرتے دکھائی دیتے تھے۔ اِن میں شہر کے سبھی لوگ شامل ہوتے تھے۔ امیر، غریب، بچے، بوڑھے، عورتیں، مرد۔ اور گوداوری ندی ہر ایک سے بات کرنے کو تیار تھی۔ ہر ایک کے ساتھ گھُل مل کر بیٹھنے پر آمادہ تھی۔ لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بُرے معنوں میں ہرجائی تھی۔ بلکہ اُس کی محبت اِس قدر بے کراں اور اُس کا دامن اِس قدر وسیع تھا۔

جب لوگ تفریح کے لئے وہاں جمع ہوتے تھے تو پھر کچھ چھابڑی والوں کا وہاں آنا لازمی تھا۔ چاٹ، دہی بڑے، پکوڑی، گول گپے، چنے، کچالو۔ سب ہی کچھ بکتا تھا۔ لوگ چٹانوں پر بیٹھے ٹانگیں ہلا ہلا کر مزے مزے میں دہی بڑے کھایا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ پھولوں کے گجرے بیچنے والے بھی آیا کرتے تھے۔ چمبیلی کی ادھ کھلی کلیوں یا پھولوں کے خوبصورت ہار ہوا میں لہراتے تھے۔ نوجوان مرد ایک آدھ ہار خرید کر کلائی میں لپیٹ لیتے اور کنکھیوں سے اپنی ہم عمر معشوقاؤں کی طرف دیکھتے۔ چاندی کے اوراق میں لپٹے ہوئے پانوں کی تھالیاں پنواڑی سلیقے سے

دھرے اِدھر اُدھر گھماتے پھرتے تھے۔

وہ زیادہ بھیڑ بھاڑ سے بچ کر ایک جانب ایک چھوٹے سے پتھر پر بیٹھا تھا۔ ندی کا پانی تلملاتا اور گاتا ہوا اُس کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اتنے میں اُس کے قریب ایک خوبصورت لڑکی آن کھڑی ہوئی۔ وہ پھولوں کے ہار بیچنے والی تھی۔

اُس نے نظر اُٹھا کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ اکہرے بدن کی کم سن لڑکی تھی۔ کم سن سے مراد یہ کہ پورے جوبن پہ نہ آئی تھی۔ شباب کی طرف قدم بڑھا چکی تھی۔ بیضوی چہرہ تھا۔ بڑی خوبصورت رنگت تھی۔ بڑی بڑی ہنس مکھ آنکھیں خمدار لچکتے ہوئے ابرو، پھڑکتے ہوئے نتھنے، نازک مملیں لب، میگوں ہونٹ، اُس نے ناسک کی عورتوں کے رواج کے مطابق باریک کپڑے کا ایک ٹلوکا پہن رکھا تھا جس میں سے اُس کی بہت چھوٹی چھوٹی چھاتیوں کے اُبھار صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اُس کے پیٹ ناف اور کمر پہ کوئی کپڑا نہ تھا۔ اُس کے بدن سے عجب تازگی اور اچھوتا پن ٹپکتا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ اِن سب ہاروں میں آدھے ہار اپنے گلے میں پہن لے اور آدھے اُس کے گلے میں پہنا دے اور پھر اُس کی ننگی کمر بازوؤں میں اِس طرح جلنے لے کہ اُس کا ہاتھ اُس کے پیٹ کو چھو رہا ہو۔ اور وہ اِس طرح باتیں کرتے ایک دوسرے کا منہ چومتے ہوئے دُور کھیتوں، جنگلوں، پہاڑوں کی طرف نکل جائیں اور پھر کھلے آسمان کے تلے ہموار زمین پر وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ کر لیٹ جائیں...... لیکن یہ سب کچھ ممکن نہیں تھا۔ کیوں؟

اِس لئے کہ وہاں جنگلوں میں پکی پکائی روٹیاں نہیں مل سکتی تھیں۔ وہ لڑکی روٹی کے بغیر ایک رات بھی اُس سے لپٹ کر سونا پسند نہ کرے۔ اور روٹیوں کے بغیر دوسرے روز ہی وہ خود یہ رومان اور عشق بھول جائے۔ روٹیوں کیلئے

گیہوں کی ضرورت تھی۔ گیہوں بھی مل سکتا تھا کہ انسان کے جیب میں پیسے ہوں۔ اور پیسے ؟...... پیسے دفتر میں کلرکی ہی کرنے سے مل سکتے تھے۔ اور کلرکی ؟ کلرکی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ کہاں ملتی ہے ؟ کیسے ملتی ہے ؟ کیا بھاؤ بکتی ہے ؟

کلرکی نبھانے کے لئے اُسے اپنے خون سے تو سینچنا ہی پڑتا ہے لیکن ان سب باتوں سے پہلے اُسے حاصل کرنا ایک معمہ تھا۔ اس معمہ کا ایک ہی حل تھا۔ وہ یہ کہ اپنی خود داری کو دفن کر ڈالے۔ عزت بیچ کر وہ خاک میں مل جائے اتنی قربانی اور انکساری کی کسی بڑی سے بڑی تپشیا میں بھی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ لیکن پیٹ کے لئے ایندھن ـــ دنیا میں سب سے بڑی ضرورت تھی اور اس ضرورت کو پورا کرنا دنیا کی بڑی سے بڑی تپشا سے بھی بڑی تپشیا۔ دوسری تپشیاؤں کی اس کے سامنے وقعت ہی کیا تھی پرماتما کے لئے۔ اور اگر پرماتما نہ بھی ملا تو کیا بگڑ جائے گا انسان کا۔ کیوں نہ پرماتما کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اگر وہ اپنے حال میں مست ہے تو انسان اپنی کھال میں مست رہے۔ مکتی کے لئے ؟ مکتی بھی نہ ہو تو کیا ہرج ہے۔ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ انسان واقعی مکت ہو جائے گا۔ لیکن سب سے بڑا سوال تو یہ تھا کہ اگر پرماتما کو حاصل کرنے یا مکتی حاصل کرنے کی تپشیا مکمل ہونے سے پہلے ہی جسم اور روح کا ناتا ٹوٹ جائے تو پھر کیسی رہے۔ نہ گھر کے نہ گھاٹ کے۔ مرنا تو برحق ہے۔ لیکن اس عمر میں.. .... صرف روٹی کے ایک ٹکڑے کے نہ ملنے کی وجہ سے مر جانا۔ انسانیت کی توہین نہیں تو پھر کیا ہے۔ جب تک دنیا میں ایک آدمی بھی بھوکا ہے، ان بڑے بڑے آرٹسٹوں اور مفکروں، سیاست دانوں، مہاتماؤں، لیڈروں، مہاپرشوں اور سائنس دانوں کا فائدہ ہی کیا ہے ؟ کیوں نہ ان سب کی گردنوں میں چکیوں کے پاٹ باندھ کر انھیں سمندر میں پھینک دیا جائے۔

اب وہ بیکاری سے تنگ آچکا تھا۔ اس مرض سے دنیا میں کوئی دوست، کوئی ہمدرد، کوئی سوسائٹی یا سبھا، کوئی حکومت، کوئی پرماتما نجات نہ دلوا سکتا تھا۔ وہ اس پردیس میں بھاگا بھاگا کیوں آیا۔ کیوں بیٹھے بٹھائے اُس کی پُرامن زندگی میں اتنا بڑا انقلاب آگیا۔ یہ اُس کا گھریلو معاملہ تھا۔ ابھی تک یہ سب صیغۂ راز میں تھا یہ ایک قابلِ شرم اور قابلِ افسوس بات تھی۔ یہ ایک بہت بڑا حادثہ تھا۔ وہ یہ راز کسی پر ظاہر نہ کر سکتا تھا۔ اُس کے گھر والے ایک ہی روز میں تقریباً کنگال ہو گئے وہ کسی کو کیونکر بتا سکتا تھا۔ وہ اِس پردیس میں نوکری کی تلاش مین آیا۔ اُس نے اِدھر اُدھر کچھ عارضی کام کیا بھی۔ لیکن چونکہ یہ اسامیاں عارضی ہوتی تھیں۔ اس لئے مقررہ زمانہ ختم ہو جانے کے بعد اُسے پھر بیکار گھومنا پڑتا تھا۔ وہ گھر پر اپنی ماں کو روپیہ بھیجتا رہا تھا۔ یونہی کچھ تھوڑا بہت روپیہ اُس کی ماں کے پاس بھی تھا۔ گھر کے اخراجات چلتے رہے لیکن اب کچھ عرصہ سے نہ اُسے کسی قسم کے کام کی کوئی صورت نظر آئی نہ گھر سے بار بار تاکید کی چٹھیاں ہی آنا بند ہوئیں۔ یہاں اس کا ایک ہی دوست تھا جو اگرچہ اُسی جگہ اُس کا نیا ہی دوست بنا تھا۔ لیکن اُسے اس پر پورا پورا اعتماد تھا۔ وہ اس پر بھروسہ کر سکتا تھا۔ یہی اُس کے ضمیر کی آواز تھی۔ اِس لئے وہ اس سے کھُل کر باتیں بھی کر لیا کرتا تھا۔ اُس نے اُسے اپنا رازداں بھی بنا لیا۔ اپنا سارا حال کہہ سنایا کہ اُس کے دو بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ بیوہ ماں تھی۔۔۔

۔۔۔ اور وہ حادثہ؟

اُس کی نوجوان بہن جو اُس سے دو ہی برس چھوٹی تھی نہ معلوم کس بدمعاش کے پھندے میں پھنس کر گھر سے بھاگ نکلی۔ اس لڑکی کو فلمی رسالے پڑھ پڑھ کر فلموں میں کام کرنے کا شوق چرایا۔ اور پھر ایسی بے وقوف چڑیا کو پھانسنے والا کوئی چڑیمار بھی اُدھر آنکلا۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ اُس نے ایسی اُلٹی پٹی

پڑھائی کہ شریف زادی ایک رات چپکے سے اُس کے ساتھ کسی طرف کو کھسک گئی۔ اور پھر جاتے جاتے گھر کے سب زیورات اور نقدی بھی سمیٹ کر اپنے ساتھ ہی لے گئی۔ کیا دنیا میں اِس قسم کی باتیں بھی ممکن ہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت تھی۔ اِس قسم کی خبریں آئے دن اخباروں میں شایع ہوتی رہتی ہیں۔ اِس کلموئی سے کوئی پوچھے کہ اگر تجھے ضرور ہی جھک مارنے تھی تو خود دفع ہو جاتی۔ لیکن گھر میں جھاڑو کیوں پھیر گئی۔ ڈائن تجھے اپنے چھوٹے بھائی اور بہنوں کا خیال نہ آیا۔ اُس بیوہ ماں پر بھی ترس نہ آیا جس نے پال پوس کر تجھ رانڈ کو اتنا بڑا کیا کہ اب تو لفنیوں پھونی ایکٹرس بننے چلی...... بہت بڑی رقم تھی جو وہ اپنے ساتھ لے کر چلتی بنی۔ اُس کے چلے جانے کے بعد ایک تو بدنامی کا ڈر۔ دوسرے روپے کی تنگی۔ گھر میں اور بچے ابھی چھوٹے تھے۔ اِن میں سے دو اسکول میں پڑھتے تھے۔ اِن سب کے اخراجات کے لئے یونہی گھر میں کوئی گری پڑی چیز باقی رہ گئی۔ ورنہ اِس کو کھ جلی بہن نے تو خوب ہاتھ صاف کیا۔ کس پچھلے جنم کا بیر نکالا چڑیل نے؟ .... سو بھائی! اپنی تعلیم بھی ادھوری چھوڑ کر پردیس کو بھاگنا پڑا۔ شہر میں گھر بدل کر دوسرے مکان میں چلے گئے تاکہ راز افشا نہ ہونے پائے۔ تم کو دوست سمجھ کر سب حال بتا دیا تم خود ہی سمجھ سکتے ہو کہ یہ کس قدر نازک معاملہ ہے۔ بھائی میرے! یہ بات بس کسی اور کے کان تک نہ پہنچے۔ حد سے زیادہ تاکید ہے۔ یہاں پردیس میں، اور کون تھا جسے یہ بتلا کر دل کی بھڑاس نکالتا۔ اب ہمارا تمھارا زیادہ فرق نہیں رہا پھر سے تاکید ہے کہ یہ بات کہیں ظاہر نہ ہونے پائے ــــ اُس کے دوست کی صورت سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ باتیں سن کر اُس کے دل کو بہت دُکھ پہنچا ہے۔ وہ اس کی مصیبت کو خوب اچھی طرح سمجھ گیا ہے۔ وہ اس کے لئے کوئی نہ کوئی ملازمت ڈھونڈ نکالے گا۔

ــــ اور واقعی چند روز بعد اُسے یہ خوشخبری ملی کہ اُسے ایک ہندوستانی

فرم میں کلرکی کی اسامی پر مقرر کر دیا جائے گا۔ سرکاری نوکری ہوتی تو بہتر تھی لیکن خیر اِس میں کیا مضائقہ ہے۔ بعض اوقات دیسی مالکوں سے بھی انسان کی پٹ جاتی ہے تو پھر کو بارہ ہو جاتے ہیں۔

وہ مقررہ دن کو منیجر سے ملنے کے لئے اُس کے دفتر میں پہنچا۔ وہ سفارشی آدمی تھا۔ منیجر نے بڑی رعونت سے اُس کو سر سے پاؤں تک دیکھا.....

"تمھارا ہی نام.......؟"

"جی ہاں"

"کہیں اور کام بھی کیا ہے؟"

اُس نے ذرا تفصیل کے ساتھ سب باتیں بتلائیں۔ منیجر نے سب کچھ سن لینے کے بعد کہا" اچھا تو تم عرضی لکھ کر ہمیں دے دو۔ درحقیقت ہمیں زیادہ تجربہ کار شخص کی ضرورت ہے۔ لیکن چونکہ تمھاری سفارش زبردست ہے مجھے خود مسٹر تیواری نے آکر کہا ہے۔ اور پھر تم مصیبت زدہ ہو ......"

"مصیبت زدہ؟"

"................ میرا خیال یہی ہے کہ تم بڑے بھائی تھے تم ذرا ہوش سے ...."

وہ پتھر کی طرح جامد کچھ دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ اُسے نہیں معلوم کہ اُس نے کیا کیا باتیں کہہ ڈالیں۔ اُس کی روح پر ایک بادل سا چھا گیا۔ وہ کچھ سوچ نہ سکا، کچھ سُن نہ سکا، کچھ بول نہ سکا.......... وہ وہاں سے چپ چاپ واپس چلا آیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اُس نے تکیہ میں مُنہ چھپا لیا۔ لیکن وہ رو نہیں سکا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بھی نہ نکلتے تھے۔ اِتنی دُور غریب الوطنی میں اُسے یہ دُکھ سہنا پڑے گا؟ وہ اِس کے لئے ہرگز تیار نہ تھا۔ یہ اُس کے دوستانے

کیا کیا۔ شاید وہ یہ سمجھا کہ اُسے نوکری چاہئیے ہر ممکن قیمت پر۔ خاندان کی بلاغتی کا بھانڈا پھوڑ کر...... کیا اس افسوسناک واقعہ کو حیلہ بنائے بغیر ملازمت تک نہ مل سکتی تھی۔ دراصل سمجھ دار دشمن اتنا نقصان نہیں پہنچاتے جس قدر احمق دوست۔ وہ منصورؒ اور شبلیؒ والا قصہ ہوا۔ منصورؒ کو سنگسار کیئے جانے کا حکم صادر ہوا۔ سربازار اُن پر پتھر پھینکے گئے۔ اُن کا جسم لہولہان ہو گیا لیکن وہ قہقہے لگاتے رہے۔ پتھر مارنے والوں کی نفرت اور اُن کے پتھر اُن پر کچھ بھی اثر نہ کر سکے۔ وہ اُن سے بے پرواہ رہے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں لاعلمی کی وجہ سے کر رہے ہیں۔ اُن لوگوں کی بے عقلی کے سبب اُن پر خفا ہونا عبث تھا۔ لیکن جب وہاں اُن کے جگری دوست شبلیؒ آنکلے تو وہ حکم شرعیت کے خلاف بھی قدم نہ اُٹھا سکے اور وہ اپنے دوست کو پتھر بھی نہ مارنا چاہتے تھے۔ اس لئے اُنھوں نے ایک پھول پھینک دیا۔ پھول کا منصورؒ کے جسم کو چھونا تھا کہ وہ چیخ اُٹھے...... یہی حرکت اس کے دوست نے اُس کے ساتھ کی۔ لیکن کیا واقعی اُس نے یہ راز منیجر کو صرف اِس لئے بتایا کہ اُسے ملازمت مل سکے یا معاملہ اس سے بھی زیادہ سنگین تھا......؟"

وہ دیر تک اسی طرح کمرے میں پڑا رہا۔ جب شام ہو گئی تو وہ اُٹھ بیٹھا دنیا بے کیف سی نظر آ رہی تھی۔ وہ اُس لنگڑے کے مانند تھا جس کی کھوکھلی بیساکھیاں دفعتہً ٹوٹ کر گر پڑیں۔ وہ ازحد پریشان تھا۔ اب کیا ہوگا؟ وہ کیا کرے؟ کدھر جائے؟ کس سے کہے؟

وہ دروازے میں سے نکل کر گوداوری کے کنارے جا پہنچا لیکن اس کا دھیان کسی اور ہی طرف تھا۔ چھابڑی والوں کی صدائیں۔ عورتوں کے کھلکھل قہقہے۔ ہجوم کی ملی جلی اُڑتی ہوئی صدائیں.... تنگ شلوکے پہنے ہوئے بانکی

عورتیں .... سب کچھ اُس کے لئے نہ صرف بے معنی تھا بلکہ بے حقیقت بھی۔ وہ اس چھوٹے سے پتھر پر بیٹھا ہوا سہیلی کے ہار بیچنے والی لڑکی کی طرف اِس طرح کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھنے لگا کہ لڑکی پریشان سی ہو کر پرے چلی گئی۔ اور وہ اُسی جگہ بیٹھا رہا.......

آج اُسے پانی کی روانی، بنسریوں کی تانوں، پھولوں کی آوارہ خوشبو جوبن کی متوالیوں کی اٹکھیلیوں غرض کسی شئے سے کوئی دلچسپی محسوس نہ ہو رہی تھی۔ دراصل وہ گھر سے اِس نیت سے چلا بھی نہیں تھا۔ وہ یونہی بے خیالی میں اس طرف چلا آیا۔ وہ عادتاً یہاں آیا تھا۔ اُس کا دماغ اور خیالات میں اُلجھا ہوا تھا۔ پاؤں ندی کی طرف اُٹھنے لگے........ یہاں پہنچ کر وہ بے چین سا ہو گیا وہ پتھر سے اُٹھا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ ایک سڑک پر ہو لیا۔

سڑک کے دونوں کناروں پر پام کے درخت کھڑے تھے۔ صاف ستھری سڑکوں کے ساتھ ساتھ اُگے ہوئے یہ درخت بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن اُس کا اِن کی طرف دھیان ہی نہیں تھا.......

اُس کے دوست نے یہ حرکت کیوں کی؟ بظاہر اُس نے اُسی کی بھلائی کے لئے یہ راز کھول دیا۔ حالانکہ اگر اُس نے اس سے دریافت کیا ہوتا تو وہ کسی بڑی سے بڑی نوکری کے لئے اِس راز کا کھلنا پسند نہ کرتا۔ اِس مسئلہ کو فلسفیانہ نقطۂ نظر سے سوچنے کا یہ کوئی محل نہ تھا۔ اُسے تو دنیاوی نقطۂ نگاہ ہی سے سوچا جا سکتا تھا۔ دنیاوی لحاظ سے کسی کی بہن کا اِس طرح گھر کی صفائی کر کے کسی غیر مرد کے ساتھ بھاگ جانا یقیناً ایک بھائی کے لئے بڑی بے غیرتی کی بات تھی۔ لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اُس کی یہ حماقت ضرور تھی کہ اُسے اپنی بہن کے اِس یارانے کا کچھ پتہ ہی نہ چلا —— وہ اُسے ایک

ذمہ دار لڑکی سمجھتا تھا۔ وہ کب جانتا تھا کہ وہ اِس قسم کے لچر خیالات میں کھوئی رہتی تھی۔ خیر وہ تو سب کچھ ہوا۔ لیکن اُس نے دوست کو رازداں اِس غرض سے بنایا تھا کہ جب وہ ایک مرتبہ اُن کے گھر کے حالات سے واقف ہو جائے گا تو پھر آیندہ گفتگو کرنے میں کوئی جھجک نہ رہے گی۔ اِس دنیا میں انسان کو ہمیشہ ایک نہ ایک رازداں اور ہمدرد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اگر اس نے اس بات کے لئے اپنے دوست کو چن لیا تو کیا بُرا کیا۔ اِس میں تو اُس کی کوئی غلطی نہ تھی۔.........

.... اور وہ اُس کا دوست کس قدر سنجیدہ شخص معلوم ہوتا تھا۔ دنیا کے نشیب و فراز سے آگاہ، انسان کی بے بضاعتی اور اُس کی کمزوریوں سے واقف اُس کے خیالات کس قدر بلند تھے۔ وہ بولتا تھا تو اُس کے الفاظ سے خلوص کی بُو آتی تھی۔ وہ وجدانی طور پر محسوس کرتا تھا کہ اُس کا دوست ایک قابلِ اعتماد شخص تھا۔ لیکن باوجود اتنی تاکید کے وہ اِس قدر غیر ذمہ دار اور احمق کیوں ثابت ہوا.......محض اُسے ملازمت دلانے کے لئے اُس نے اُس کی بنی بنائی عزت پر بٹہ لگا دیا۔ اب منیجر کے مُنہ میں لگام کون دے سکتا تھا؟ کیا وہ کسی اور کو اِس بات سے آگاہ کرنے سے پرہیز کرے گا۔ ناممکن۔ اور پھر کیا ایسے دفتر میں کام کیا جا سکتا تھا جہاں سب جانتے ہوں کہ فلاں شخص کی بہن.... اگر اُس کے دوست کا منیجر کو واقعی کچھ لحاظ تھا اور وہ اپنا کچھ رسوخ استعمال کر سکتا تھا تو پھر اِس بات کا ذکر چھیڑنے ہی کی کیا ضرورت تھی...... لیکن یہ سب کچھ غلط تھا۔ حقیقت کچھ اور تھی۔ در اصل یہاں انسان کا فطری کمینہ پن کام کر رہا تھا۔ دنیا میں ہر شخص بیمار تھا۔ ہر شخص میں عیب تھے۔ کمزوریاں تھیں۔ اسے اِن باتوں کا شدید احساس تھا۔ اِس لئے جب اُسے اپنے کسی ہم جنس کی کسی

مصیبت کا پتہ چل جائے تو پھر آپس میں کانا پھوسی کر کے اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے کہ اس دنیا میں اُسی میں برائیاں نہیں دوسروں میں بھی ہیں۔ انسان اپنی کمزوریوں کو دور کرنے سے ہمیشہ قاصر رہتا ہے۔ لیکن وہ اپنی تسکین کا پہلو اسی قسم کی عیب جوئی اور غیر کے معائب کا ذکر کر کے ہی پیدا کر لیتا ہے........ وہ ازل ہی سے کمینہ ہے۔ اس کی انسانیت کے ساتھ ساتھ ایک قسم کی درندگی بھی لپٹی ہوئی ہے۔ جب کبھی یہ درندگی اُبھر آتی ہے تو پھر انسان سے شیطان بھی پناہ مانگتا ہے۔ ہر انسان بہت ہی احمقانہ طور پر یا احمقانہ حد تک عقلمند ہے۔ اِس کی یہ گراوٹ شاید ابد تک دور نہ ہو۔ اگر یہ ابد تک دور نہ ہو سکی تو دنیا میں دکھوں کا خاتمہ ہونا معلوم.......... بدی انسان کی ہڈیوں میں کچھ اس طرح رَچ گئی ہے کہ اس کے جسم سے اسے دور کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ یہاں تک کہ کسی عزیز سے عزیز دوست پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ جب بھروسہ نہ ہو تو کوئی انسان کسی کو اپنا ہمراز نہیں بنا سکتا۔ کسی کو بھی اپنا ہمراز نہ بنا سکنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان دنیا میں اکیلا رہا کرے....... تنہا..... تنہا.. ..... ازل سے ابد تک تنہا....... اس قدر وسیع دنیا میں، ان بیشمار دکھوں کا مارا ہوا انسان اور پھر تنہائی کی شدت کا احساس........ یہ اذیت تو کسی دوزخ کی بڑی سے بڑی سزا سے بھی بڑھ کر ہے۔ کیا دنیا میں انسان کو کبھی کوئی ساتھی نہ مل سکے گا۔ کیا وہ کبھی کسی رازداں کو نہ پا سکے گا۔ کیا کبھی کوئی ایسی ہستی وجود میں نہ آئے گی جس کے کان میں وہ دل کی بات اس یقین پر کہہ سکے کہ وہ یہ بات اور کسی سے نہ کہے گا۔ وہ اسے دل ہی میں رکھے گا......

چلتے چلتے وہ بے خبری کے عالم میں شہر سے بہت دُور نکل آیا۔ وہ اِس قدر کھویا کھویا سا تھا کہ اُسے اپنے قریب سے گزر جانے والے لوگوں کا بھی

کچھ احساس نہ تھا۔ اُسے خیال ہی نہیں آیا کہ وہ معمولی چڑھائی کی سڑک طے کرتا
تھا۔ شہر کی رنگ

ہی تھیں۔

پر قطار

در قطار کھڑے ہوئے درخت بہت بھلے دکھائی دے رہے تھے۔ سڑک کے ارد گرد کھیتوں میں پانی بھرا تھا اور بڑھتی ہوئی تاریکی میں وہ پانی ایک بہت بڑی جھیل کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اس میں بجلی کے قمقموں کی روشنی متحرک تھی۔

اس کے آگے ایک خاصی بلند سرسبز پہاڑی تھی۔ دور پہاڑی کے اندر کھدے ہوئے بہت بڑے مندر کے آگے وسیع سیڑھیوں سے عورتیں اور مرد چڑھ اتر رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ مندر کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچ کر وہ سیڑھیوں کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ اُس نے جوتوں کے تسمے کھولے۔ چند کنکر جوتوں کے اندر چلے گئے تھے اُس نے اُنھیں جھاڑ کر باہر نکالا اور پھر وہ وہیں لیٹ گیا۔ سیڑھیوں کے پتھر بہت سرد تھے۔ اس کے تکان زدہ جسم کو اُن کی ٹھنڈک سے راحت کا احساس ہوا۔

سامنے کچھ فاصلہ پر مندر کا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ یہ بہت ہی بڑا دروازہ یونہی پہاڑ کو کھود کر بنا دیا گیا تھا۔ اس میں تختے نہیں لگے ہوئے تھے۔ اس لئے چوبیس گھنٹوں میں جب کسی کا جی چاہے وہ اس کے اندر جا سکتا تھا۔

وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ آنے جانے والی عورتوں اور مردوں کو دیکھتا رہا پھر وہ اُٹھا اور آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ اُس نے دروازے کے اندر جھانک کر دیکھا تو سامنے پہاڑ کو اندر سے کھود کر بہت وسیع ہال بنایا گیا تھا۔

پہلے سرے پر پتھر کے تین بڑے بڑے دیوتا آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ ان میں سے درمیان والا بت سب سے اونچا تھا۔ وہ تقریباً ساٹھ فٹ بلند ہوگا۔ اُس کے دائیں بائیں دوسرے دیوتا جو جسامت میں اُس سے کم تھے اُسی کی طرح آلتی پالتی مارے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے سیدھے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ فن سنگ تراشی کے اعلیٰ نمونے تھے۔ ان کے چہروں کے خدوخال صاف طور پر عیاں تھے۔ ان کے لبوں پر ایک دائمی مسکراہٹ ثبت ہو چکی تھی۔ وہ ابد تک اسی طرح چپ چاپ مسکرائے جائیں گے۔ بہت دُور دُور سے لوگ وہاں جمع ہوتے تھے۔ ہر انسان کے دل میں کوئی نہ کوئی تمنا اور کوئی نہ کوئی بھید ہوتا ہے۔ وہ ہاتھ باندھے ننگے پاؤں ان دیوتاؤں کی خدمت میں آتے ہیں۔ دل ہی دل میں اپنی بات دُہرا دیتے ہیں۔ دیوتا اپنے پرستاروں کے دلوں کا حال پا لیتے ہیں۔ وہ مسکراتے ہیں مُنہ سے کچھ نہیں کہتے۔ یہاں تک کہ دن رات اُن کی خدمت میں رہنے والے پجاری بھی نہیں جانتے کہ دیوتا سے کون شخص کیا بات

رفتہ رفتہ بھیڑ کم ہو رہی تھی۔ ہال کے اندر شمعیں روشن تھیں۔ کسی تیز خوشبو سے سارا مندر مہکا ہوا تھا۔ پتھریلے فرش پر پانی پھیلا ہوا تھا۔ اِدھر اُدھر گیلے فرش پر سُرخ نیلے اور سپید پھول بکھرے ہوئے تھے۔۔۔۔۔۔

کوئی نہ کوئی شخص مندر کے بیچوں بیچ لٹکا ہوا کانسے کا گھڑیال بجا دیتا تھا۔ اور اس پُر اسرار خاموشی میں کتنی ہی دیر تک گھڑیال کی سمجھ میں نہ آنے والی آواز پر معنی انداز میں لرزتی رہتی تھی۔۔۔۔۔۔

وہ ان بے جان پتھر کے مسکراتے ہوئے دیوتاؤں کو قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے جوتے اُتار دیئے اور قدم بڑھا کر پاؤں نمدار فرش پہ

رکھ دیا۔ وہ ایک مسرور کر دینے والی خوشبو میں لپٹ گیا۔ مدھم روشنی میں دیوتا بدستور مسکرائے جا رہے تھے اور وہ لحظہ بہ لحظہ.................. قدم بہ قدم.........آگے بڑھتا جا رہا تھا۔........

بھک منگے

اگرچہ سورج طلوع ہو چکا تھا لیکن ابھی سڑکوں، بازاروں اور گلیوں میں وہ چہل پہل شروع نہ ہوئی تھی۔

اِس بھک منگے کا کوئی گھر گھاٹ نہ تھا۔ محلے میں کسی نے یونہی ٹوٹا پھوٹا چھکڑا ایک طرف پھینک دیا تھا۔ بھکاری نے اُس پہ ٹاٹ وغیرہ ڈال کر ایک اوٹ سی بنا لی تھی۔ وہ اِسی کے اندر زندگی بسر کرتا تھا۔ اندر جگہہ بہت تنگ تھی لیکن اُسے زیادہ جگہہ کی ضرورت بھی نہ تھی۔ کیونکہ اُس کی ٹانگیں گھٹنوں کے اوپر سے کٹی ہوئی تھیں۔ بچپن ہی سے اُس کی ٹانگیں ایسی تھیں۔ اُسے کچھ یاد نہیں کہ اُس کی ٹانگیں کسی حادثے میں کٹ گئی تھیں یا وہ اسی طرح پیدا ہی ہوا تھا۔ اب وہ پاؤں کے بل تو خیر چل ہی نہیں سکتا تھا۔ لکڑی کی ایک ایک ٹیک ہاتھ میں لئے اُنھیں کے بل پہ آگے گھسٹ گھسٹ کر بڑھتا تھا۔ بانہوں کے بل پہ وہ زمین سے زیادہ اونچا نہ اُٹھ سکتا تھا۔ اس لئے جب وہ گھسٹتا ہوا چلتا تھا تو اُس کی کمر سے بندھا ہوا کپڑا اسٹرک کی ساری غلاظت سمیٹتا جاتا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر لوگوں کے دلوں میں سخت گھن

بظاہر اُس کی صورت میں کوئی خرابی نہ تھی۔ اُس کی شکل ایسی ہی تھی جیسی عام ہندوستانیوں کی ہوتی ہے۔ ناک، آنکھ، ہونٹ، دانت ہر چیز صحیح و سالم تھی۔ اُس کے بازو مضبوط، ہاتھ چوڑے چکلے، اور جسم کا باقی ڈھانچہ بھی درست تھا لیکن ٹانگوں کی وجہ سے وہ بیچارا بے کار تھا۔

اُس کی صورت سے متانت اور غربت اسی طرح ہویدا تھی جیسی کہ بھکاریوں کے چہرے سے ہونی چاہئے۔ ہر وقت ہاتھ پھیلائے رہنے کے سبب اُس کے چہرے کے مردانہ تیور غائب ہو چکے تھے۔ ہر آنے جانے والے کی طرف اُس کی بھوکی آنکھیں گھور گھور کر دیکھا کرتی تھیں۔ اِدھر کسی بابو کی صورت نظر آئی اُدھر اُس نے گھگھیا کر دانت نکال دیئے۔ بڑے لجاجت آمیز لہجہ اور مسکین آواز میں وہ دعاؤں کا تانتا باندھ دیتا۔ بھوک، بے آرامی اور تفکرات کی وجہ سے اُس کے جسم کے ڈھانچے پر گوشت بس برائے نام ہی تھا۔

اِدھر صبح ہوئی۔ غلاظت کی گاڑی کے آگے بیٹھے ہوئے بھنگی نے تان اُڑائی اُدھر بھکاری کی آنکھ کھلی۔ لوگ اپنے اپنے کاموں پر جانے کی تیاریاں کرنے لگے تو اُس نے بھی باہر جانے کی ٹھانی۔ اُسے تیاری تو کچھ کرنی نہیں تھی۔ البتہ وہ ناریل پی لیا کرتا تھا۔ اُس اُپلے کا ایک ٹکڑا چلم پر رکھا اور اس میں ایک چیتھڑا ٹھونس کر آگ لگا دی........ پھر وہ اطمینان سے بیٹھا دم لگاتا رہا۔ وہ کنکھیوں سے سڑک کی طرف بھی دیکھ رہا تھا کہ ذرا لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو تو وہ بھی اپنے اڈّے پر جا پہنچے۔

رفتہ رفتہ لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکلنے لگے۔ سڑک پر سائیکلیں اور تانگے بھی چلنے لگے۔ بھکاری نے بھی اپنا کٹورا جھولی میں ڈالا اور گھسٹتا ہوا سڑک کی طرف بڑھا۔ وہ اُس جگہ بیٹھا کرتا تھا جہاں میونسپلٹی کا گندگی کا

بہت بڑا ڈھول پڑا تھا۔ وہاں بیٹھنے میں بھی ایک مصلحت تھی۔ وہ بیکڈ ڈھول کے سائے میں وہ دھوپ کی گرمی سے بچا رہتا تھا۔ غلاظت سے لبریز ڈھول کے قریب بیٹھا ہوا وہ خود بھی ایک چھوٹا سا گندگی کا ڈھول دکھائی دیتا تھا۔ کچھ کھیاں تو یونہی اُس پر منڈلاتی رہتی تھیں۔ اور کچھ اُس ڈھول کی صحبت کی وجہ سے اُس کے حصّے میں آتی تھیں۔

جھولی سے کٹورا نکال کر اُس نے آگے بڑھا دیا۔ اُس نے کٹورے میں چند پیسے بھی ڈال دیئے۔ پیسے کو پیسہ کماتا ہے۔ اُس کے کٹورے میں دو تین پیسے دیکھ کر کوئی راہگیر اپنا پیسہ بھی اُس میں پھینک دیتا تھا۔

گرمیوں کے دن تھے دھوپ کی تمازت بڑھتی جا رہی تھی۔ لوگ جلد سے جلد اپنے دفتروں، مکانوں، اسکولوں یا کالجوں میں پہنچ جانا چاہتے تھے۔ لیکن اس کے لئے جلدی کی کوئی بات نہ تھی۔ ابھی اُسے ڈیڑھ دو بجے تک اسی جگہ بیٹھنا تھا۔ پھر وہاں سے دو گھنٹے کے لئے چلے جانے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اُسے گرمی محسوس ہوتی تھی۔ بلکہ یہ کہ اُس وقت گلی کا ایک کتّا تک سڑک پر گھومتا نظر نہ آتا اور آدم زاد کا خیر ذکر ہی کیا۔

ہر آنے والا دُور سے بڑا سخی دکھائی دیتا تھا۔ لیکن قریب پہنچ کر اُس کی صورت ایسی دکھائی دینے لگتی تھی جیسے وہ خود اُس ... کے جسم کے چیتھڑے تک اتار لینے سے دریغ نہ کرے گا۔ انسانوں کے اس ہجوم میں اگر کسی شخص پر کسی دُعا کا نشانہ ٹھیک جگہ جا لگتا تو پھر اُس کی جیب میں سے ایک پیسے کا نکل آنا کچھ ایسا مشکل بھی نہ تھا۔

وہ اپنے کٹورے میں دو چار پیسوں سے زیادہ نہ رہنے دیتا تھا۔ جہاں کچھ پیسے جمع ہوئے اُس نے اُنھیں اُٹھا کر اپنی پھٹی قمیص کے اندر

پہنی ہوئی بنڈی کی اندر کی چھوٹی سی چور جیب میں ٹھونس لیا۔

جب اِدھر سے گزرنے والوں کا پہلا ریلا ختم ہو گیا تو پھر آمدورفت کم ہو گئی۔

نو بجے سے دس بجے تک آمدورفت بہت بڑھ جاتی تھی۔ کیونکہ اِس وقت دفتر اور اسکول کھلتے تھے۔ بابوؤں، لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹولیاں شور مچاتی خاک اُڑاتی اُس کے پاس سے گزر جاتی تھیں۔ سائکلوں اور تانگوں کی بھی بھرمار ہوتی تھی۔ لیکن دس بجے کے بعد سڑک پر وہ چہل پہل نہ رہی تھی۔ اب کاروباری، بیکار یا آوارہ گرد لوگ رہ جاتے تھے۔ جو محلے کے کتوں پر ڈھیلے پھینکتے یا اُن کو دھتکارتے ہوئے اِدھر اُدھر میٹر گشت کرتے تھے۔

چہل پہل ختم ہو جانے کے بعد بھکاری بھی ذرا آرام سے بیٹھ جاتا تھا۔ پہلے تو پیسے چھنا چھن اُس کے کٹورے میں گرتے ہیں اور پھر کبھی کبھار کوئی شخص اُدھر سے گزرا، سخاوت کے جذبہ نے زور مارا تو اُس کے کٹورے میں بھی ایک آدھ پیسہ آن گرا۔ لیکن جب کسی سے اُسے ذرہ برابر بھی یہ امید ہوتی اُس کے آگے ہاتھ پھیلانے سے ہرگز نہ چوکتا تھا۔

سر پہ کپڑا ڈالے وہ چلچلاتی دھوپ میں اُڑتے ہوئے ذروں کو دیکھ رہا تھا۔ اِتنے میں اُسے دور سے ایک اچھے خاصے لالہ آتے دکھائی دئے۔ اُس نے فوراً کٹورے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ جب وہ کچھ نزدیک آئے تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے محلے ہی کے لالہ ہیں۔ ہاں آج ذرا معمول کے خلاف چکنے چپڑے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ اپنے لالہ پیسہ کہاں دینے والے تھے۔ لیکن اب ایک مرتبہ کٹورا اُٹھا ہی لیا تھا اُسے بڑھا دینے میں ہرج ہی کیا تھا "بھگوان تمہارے دل کی منشا پوری کریں گے!"

پہلے تو لالہ ایک زناٹے کے ساتھ اُس کے قریب سے گزرنے لگے تھے پھر نہ معلوم کیا خیال آیا۔ وہیں رُک گئے۔ اُن کی جھاگ سی پھولی ہوئی دھوتی ہوا میں لہرانے لگی۔ اُنھوں نے اپنے گول مٹول ہاتھوں سے اپنی اُجلی قمیص کی جیبوں کو ٹٹولا لیکن ادھنی سے کم کا کوئی سکہ ہی نہ تھا۔ پُن کرنے کا خیال ترک کرنے ہی لگے تھے کہ یکایک کچھ خیال آیا۔ فوراً اپنے سر سے گاندھی ٹوپی اُتاری اور اُس کے ایک سرے کو ہٹا کر اندر سے دو پیسے اور ایک دھیلا نکالا۔ پہلے تو دھیلے والا ہاتھ آگے کو بڑھایا پھر نہ معلوم کیا سوچ کر ٹن سے ایک عدد نقد پیسہ اس کے کٹورے میں پھینک کر سینہ تانے آگے بڑھ گئے۔

وہ لالہ لیکھ رام جی تھے۔ محلے کے بڑے پُرانے دُکاندار تھے۔ عمر گزری تھی اسی دشت کی سیاحی میں...... اُن کے باپ دادا بھی یہیں دُکان کرتے آئے تھے۔ اُنھوں نے ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو لوہے کی چھوٹی سی الماری کے قریب سانپ کی طرح بیٹھے پایا اور پھر اُنھوں نے گدی کو نہیں چھوڑا۔

یہ ایک تعجب انگیز بات تھی کہ آج اُنھوں نے بھکاری کو دھیلا نہ پائی اکٹھا ایک پیسہ دے ڈالا تھا جب سے جنگ چھڑی تھی اُن کا حال پتلا ہو رہا تھا۔ نہ دُکان میں مال تھا نہ کہیں سے آنے کی امید تھی۔ جو مال تہ خانوں میں چھپا رکھا تھا وہ پولیس والوں کے ڈر سے باہر نہ نکالتے تھے۔ خصوصاً یہ دن اُن کے لئے بہت سخت آن پڑے تھے۔ اِدھر گورنمنٹ نے راشننگ کا طریقہ جاری کر دیا۔ لالہ پُرانے گھاگ تھے۔ اُنھوں نے سوچا کہ اگر انھیں ڈپو کھولنے کی اجازت مل جائے تو سمجھو پَو بارہ ہیں۔ دُکان میں گیہوں اور آٹے کا سرکاری اسٹاک تو رہے گا ہی، اِس کے ساتھ اپنا مال بھی کھپا ڈالیں گے۔ راز والوں نے لقمہ دیا

ابھی لالہ کون دیکھتا ہے۔ کسی کی مجال بھی ہے۔ آنکھوں میں ایسی صفائی سے دھول ڈالو کہ بس .....

لالہ سچ مچ آنکھوں میں دھول ڈالنے پر آمادہ ہو گئے۔ اُنھوں نے اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ شروع کی۔ ایک لمبی چوڑی عرضی راشننگ کنٹرولر کے نام لکھوائی۔ ایک شخص سے لکھوائی تو دس اشخاص سے پڑھوائی۔ ہر نئے دیکھنے والے نے اس میں کچھ ترمیم کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عرضی بہت شاندار اور پُر اثر ہو گئی۔ گورنمنٹ کو اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے اُنھوں نے مختلف دلائل سے اپنے آپ کو اس خدمت کا اہل ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ مثلاً اُن کا یہ آبائی پیشہ تھا اور اس محلے میں وہ عرصہ دراز سے دُکان کر رہے تھے — یہ تو اُن کے پھولے ہوئے پلپلے پیٹ ہی سے ظاہر تھا۔ یا وہ بڑے ایماندار شخص تھے۔ واہ لالہ جی! بھلا یہ بھی کوئی کہنے کی بات تھی۔ ایمانداری اور حلال کی روٹی تو آپ کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہیں .... محلے کے سب باعزت لوگ اس بات کے خواہشمند تھے کہ ڈپو کی ذمہ داری انھیں کو سونپ دی جائے اور اپنی اس دلیل کے ثبوت میں وہ اس عرضی کو ٹائپ کروا کر خود بہ نفس نفیس لوگوں کے گھروں میں پہنچے۔ خوب گھگھیا کر دانت نکال نکال کر اپنا مدعا بیان کیا۔ اس طرح سارا دن مارے مارے پھرنے کے بعد شام تک اُن کا حلیہ بگڑ گیا۔ چہرہ گرد میں اٹ گیا۔ بالآخر عرضی روانہ کر دی گئی۔

اب لالہ جی عرضی کے جواب کے منتظر تھے۔ اِسی لئے جب بھکاری نے کہا کہ "بھگوان تمھارے دل کی منشا پوری کریں گے" تو اُنھوں نے اُسے ایک پیسہ دے دینے میں کوئی ہرج نہیں سمجھا۔ لالہ بھی جانتے تھے جنت کی حقیقت لیکن ...... ہرج ہی کیا تھا اگر کوئی ایک پیسہ لے کر نیک خواہشات کا

اظہار ہی کر دے .... چلو یونہی سہی ۔

بھگوان اور محلے کے لوگوں کی پوری قوت اپنی لپشت پر ہونے کے باوجود لالہ سمجھتے تھے کہ ابھی راہ میں اور رکاوٹیں بھی ہیں ۔ اِن میں سے ایک خاص رکاوٹ تو راشننگ کے انسپکٹر تھے ۔ جنھیں خوش رکھنا نہ صرف اب ضروری تھا ۔ بلکہ عرضی منظور ہو جانے کے بعد بھی اُن کی نظرِ عنایت کی ضرورت تھی ۔ اگر اِن سے بگڑ گئی تو سمجھو دنیا میں ہر شخص سے بگڑ گئی ۔ اور پھر تو ایسی حالت پیدا ہو سکتی تھی کہ اگر خود بھگوان دھرتی پر اُتر آئیں تو بگڑے کام کو سنوار نہ سکیں ۔ یہ انسپکٹر صاحب بھی بڑے ظالم تھے اِس لئے لالہ اُن کی بڑی خوشامد کرتے تھے ۔ اگر انسپکٹر کی صورت دور ہی سے دکھائی دیتی تو آپ فوراً دُکان سے اُتر کر سڑک پر ننگے سر ننگے پاؤں جا کھڑے ہوتے ۔ دور ہی سے دانت نکال نکال کر اظہارِ مسرت کرنے لگتے ۔ انسپکٹر کے قدموں میں نگاہیں بچھا دیتے ۔ اِن کا ہر قدم اپنی پلکوں کے زور سے اُٹھاتے ۔ اپنے ہاتھوں کو آپس میں ملے جاتے ۔ جب دُکان کے قریب آپہنچتا تو بڑے خوشامدانہ لہجہ میں کہتے " آئیے آئیے انسپکٹر صاحب! اجی میں تو آپ کو دُور ہی سے دیکھ لیتا ہوں ۔ اِن کمبختوں کو میں ہی تو بتاتا ہوں کہ ہمارے انسپکٹر صاحب چلے آرہے ہیں .... آئیے تشریف لائیے .. .. اِدھر ہو لیے ۔ انسپکٹر صاحب کو .... کرسی لا لے جلدی ۔ کہاں مر گیا ؟ ......"

انسپکٹر صاحب رومال سے پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے بیٹھ جاتے لالہ پوچھتے ہیں " کہئے کیسے آنا ہوا حضور کا "

انسپکٹر صاحب بے پروائی سے کہتے ہیں " ارے بھئی یونہی اِدھر چلا آیا .... کوئی کام وام ہوتا نہیں .... " انسپکٹر صاحب یہ بات

ضرور کہتے تھے کہ انھیں کوئی کام نہیں کرنا پڑتا۔ سرکار انھیں بس مفت ہی کی تنخواہ دیتی ہے ـــــ لالہ بچارے کو کیا پتہ کہ انسپکٹر صاحب کو باولے کتے کی طرح صبح سے شام تک گلی کوچوں کی خاک چھاننی پڑتی ہے تب کہیں اُن کا پنڈ چھوٹتا ہے۔

لالہ زمین پر بچھے جاتے ہیں " ہی ہی ...... ٹھیک ہے صاحب!" پھر وہ اِرد گرد کھڑے ہوئے چار پانچ آوارہ مزاج نوجوانوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے " ارے کہیں افسروں سے بھی کام لیتی ہے سرکار .... افسر کا کام ہے بس " دس خط " کرنا۔ دو لکیریں اِدھر دو لکیریں اُدھر۔ کیوں بھئی بولو نا کہیں سرکار افسروں ....

اِنسپکٹر صاحب ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہیں۔ لالہ جھک کر کہتے ہیں "جی پانی والی پئیں گے کیا؟"

لالہ تو پانی والی کہتے ہیں۔ انسپکٹر صاحب کو ذرا دور کی سوجھتی ہے۔ مُنہ بگاڑ کر کہتے ہیں " اجی جانے دو لالہ تمھارے محلے میں یہ سوڈے دوڈے کی بوتلیں بہت ہی ردّی ہوتی ہیں۔ میں اِن کی رپورٹ بھی کرنے والا ہی ہوں .... " جیسے سچ مچ رپورٹ کر ہی تو دیں گے۔

" ارے صاحب " لالہ جی مُنہ پھیلا کر کہتے ہیں۔ " بڑا شاندار سوڈا ہوتا ہے چندن والوں ...... ابے لائیو .... پکڑ لیو ایک بوتل 'لیم لٹ' کی .... اِنسپکٹر صاحب بھی کیا یاد کریں گے ......"

انسپکٹر صاحب بوتل تو مزے کے ساتھ حلق میں اُتار لیتے ہیں۔ لیکن لالہ کو یاد نہیں کرتے کبھی ....

لالہ جی بھکاری کو ایک پیسہ دے کر اپنی دوکان میں داخل ہوئے۔ ایک روز

پہلے انسپکٹر نے کہا تھا کہ وہ اُس کی دُکان پر آئیں گے۔

لالہ جی نے گدی پر بیٹھتے ہی ہر چیز کو جھاڑ پونچھ کر صفائی کروا دی۔ آج وہ خود بھی ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ دراصل انسپکٹر صاحب نے انھیں بتا دیا تھا کہ اُن کے ساتھ وارڈ افسر بھی ہوگا۔ لالہ جی نے دو چار اچھی اچھی کرسیوں کا انتظام بھی کر لیا۔ پنواڑی کو اچھے اچھے پان چاندی کے ورق میں لپیٹ کر پیش کرنے کے لئے کہہ دیا۔ چندن والوں کی تیار کردہ بوتلوں اور برف کا انتظام بھی کر دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد شور اُٹھا کہ آ گئے انسپکٹر صاحب اور اُن کے ساتھ وارڈ افسر بھی تھا۔

بس پھر کیا تھا لالہ کو پسینہ چھوٹنے لگا۔ پنکھیا جھلتے ہوئے دُکان سے باہر نکل آئے اور حسب معمول لگے مسکرانے اور پیٹ مٹکانے ..... جب وہ دونوں آ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے "لیم لیٹ" کی بوتلیں پلائی گئیں۔ وارڈ افسر نے اُچک کر دُکان کا جائزہ لیا۔ لالہ جی ہاتھ باندھے اُن کی نظروں کے ساتھ ساتھ گھوم رہے تھے۔ بات بات میں جھک جھک کر آداب بجا لاتے تھے اُن کی ناک زمین کو چھو چھو جاتی تھی۔ آخر کار دوکان کا معائنہ ختم ہوا۔ اتنی خاطر تواضع کرنے کے بعد وارڈ افسر نے اظہار پسندیدگی کرنے میں چنداں ہرج نہ سمجھا۔

وارڈ افسر صاحب ذرا ٹہلتے ہوئے پرے ہٹے تو انسپکٹر صاحب نے چپکے سے فرمایا "میں نے آپ کی بڑے زور کی سفارش کر دی ہے کل تک آپ کو اجازت مل جائے گی۔

"وہ مارا" لالہ نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔ اُن کا چہرہ سرخ ٹماٹر

ہوگیا فوراً انسپکٹر صاحب کی ٹانگیں دبانے لگے۔

انسپکٹر صاحب اِس طرح رُعب جما کر وارڈ افسر کے پیچھے پالتو کتے کی طرح بھاگ نکلے۔ اُنھیں ڈر تھا کہ کہیں وارڈ افسر ناخوش نہ ہوجائے۔ وارڈ افسر بہت سخت قسم کا انسان تھا۔ بات بات پر بگڑ جاتا تھا۔ انسپکٹر صاحب کا نام تھا رامجی داس ...... جنگ چھڑنے سے پہلے وہ ایک آوارہ گرد شخص تھا۔ دسویں پاس کو لڑائی سے پہلے پوچھتا ہی کون تھا۔ بچارے ایم۔ اے پاس مارے مارے پھرا کرتے تھے۔ بی۔ اے۔ پاس بوٹ پالش کرتے اور چارپائیاں بُنا کرتے تھے۔ اور دسویں پاس بچاروں کے لئے اِس سے ذلیل تر کوئی کام باقی نہ بچا تھا لیکن جنگ چھڑی اور یاروں کی بھی سنی گئی۔ اب رام جی داس انسپکٹر کہلانے لگے انھوں نے بڑی خوشامد اور چاپلوسی کے بعد کہیں جا کر یہ ملازمت حاصل کی تھی۔ اکیلی جان، چند بندھے ٹکے ہر مہینے ہاتھ لگنے لگے تو انسپکٹر رامجی داس بھی خوب بن ٹھن کر رہنے لگے۔ تنخواہ بھتہ وغیرہ ملا کر سنو سے اوپر جا پہنچتی تھی۔ اِن کے لئے یہی کیا کم تھی۔ اور پھر اس کے علاوہ بالائی آمدنی بھی تھی۔ یہ بالائی آمدنی تو بس دودھ کے کڑاہ پر جمی ہوئی موٹی ملائی کی تہ تھی اِن کے لئے۔ بس یونہی پکڑ کر گانٹھ دیا کسی کو۔ ڈرا دیا کہ بس اب ڈیفنس آف انڈیا میں دھروا دوں گا وہ بچارا ڈرا اور اُنھوں نے اُس کے پلّے سے کچھ جھاڑ لیا۔ ابھی چند ہی روز پہلے کی بات تھی کہ اسی محلے کے ایک ناریل سے سر والے احمق سکھ کو انھوں نے دھر لیا۔ وہ بچارا کہیں غلطی سے زائد راشن لے بیٹھا۔ یہ اُس کے سر پہ سوار ہوگئے۔ اس سکھ نے اپنے پلپلے بازوؤں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گڑگڑا کر معافی مانگی۔ لیکن یہاں اِن کی لغت میں معافی کا لفظ ایک سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ یہ چاہتے تھے کہ کچھ نہ کچھ جھاڑ لیا جائے۔ لیکن پہلے وہ حضرت بھی شہر بھر کے

کنگالوں کے "سچے بادشاہ" تھے۔ بھلا چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ انسپکٹر صاحب نے پھر جرح کی اُلٹ پلٹ اور ہیر پھیر کے سوالات کئے۔ آخر معلوم ہوا کہ حضرت آرٹسٹ ہیں۔ چنانچہ رام جی داس نے کہا لاؤ بھائی ہمارا ایک پورٹریٹ ہی بنا ڈالو۔ وہ جھٹ اس پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ جناب انسپکٹر صاحب چند روز آرٹسٹ کے یہاں جاکر کرسی پر بیٹھے رہتے۔ تصویر تیار ہو گئی اور اُنھوں نے بلا دستخط کے اُسے لے کر چوکھٹے میں جڑا کر اپنے کمرے میں لٹکا دیا۔ کوئی پوچھتا تو کہتے "بھائی! یہ میرے ایک دوست کی بنائی ہوئی تصویر ہے۔ "ورلڈ فیم" World fame کے آرٹسٹ ہیں..... ان کا نام سُنا نہیں تم نے؟.... ارے واہ بھئی واہ.......

رامجی داس کو اس بات کا خیال نہ تھا کہ یہ جنگ عارضی ہے۔ اور راشننگ محکمے جنگ سے بھی عارضی محکمے ہیں۔ اِس لئے یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ وہ لوگوں کو لوٹ کھسوٹ کر مفت میں بدنامی مول لے۔

ابھی اُس کے خیالات بہت بلند تھے۔ اُس کی دلی خواہش یہ تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح کپڑوں کے انسپکٹر کی حیثیت سے لے لیا جائے۔ لیکن رستے میں بہت سی دقتیں حائل تھیں۔ وہ اِن کو رفتہ رفتہ دور کر رہا تھا۔ آہا کاش وہ ایک مرتبہ کپڑے کا انسپکٹر بن جائے تو پھر چاندی ہی چاندی ہے گیہوں وغیرہ لینے والی "مرغیاں" اول تو زیادہ انڈے ہی نہیں دیتی ہیں اور اگر کبھی ایک آدھ انڈا دے بھی دیا تو یونہی چھوٹا اور بے کار سا..... اور اُدھر کے کیا کہنے۔ ایک مرتبہ کوئی لکھپتی مرغی پھنس جائے تو بس پھر جنم جنم کی کسریں پوری ہو جائیں۔ اِسی لئے وہ اسسٹنٹ کنٹرولر سے تعلقات بنائے ہوئے تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً اُس کی کوٹھی پہ جایا کرتا تھا۔ کبھی پھلوں کی ٹوکری لے جاتا،

کبھی بچوں کے لئے خوبانیاں، اخروٹ اور چلغوزے وغیرہ لے جاتا...... یہ درست ہے کہ اُسے وہاں جاکر آدھ یا پون گھنٹہ برآمدے میں کھڑے رہنا پڑتا تھا۔ اسسٹنٹ کنٹرولر صاحب کو اُن کے وہاں جانے کی کچھ ایسی پروا بھی نہیں تھی۔ بڑی دیر کے بعد کہیں نکلتے۔ یہ سلام کے وقت دُہرے ہوہو جاتے وہ یونہی ذرا سر کو حرکت دے کر اظہارِ خوشنودی کرتے۔ یہ پھلوں کی ٹوکری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے "جی یہ الٰہ آباد کے امرود ہیں۔ ہمارے ایک عزیز وہاں رہتے ہیں اُنھوں نے ایک بڑا سا ٹوکرا لیا تھا۔ چند اچھے اچھے دانے لے کر حاضر ہوا ہوں مجھے امید ہے کہ........

اسسٹنٹ کنٹرولر اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ امرود حضرت کو کسی نے نہیں بھیجے سیدھے بازار سے اُٹھائے لئے آرہے ہیں..... وہ نوکر کو اشارہ کرتے اور وہ ٹوکری لے کر اندر چلا جاتا۔ اس کے بعد یہ سلام کر کے واپس لوٹ آتے۔

اسی طرح روز روز کی چاپلوسی سے خوش ہو کر ایک روز اسسٹنٹ کنٹرولر نے اِن پر بہت عنایت کی۔ انسپکٹر رامجی داس اُن سے ملنے گئے وہ برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے بلکہ پی چکے تھے۔ یہ پہنچے تو انھوں نے انھیں بھی شامل کر لیا۔ یہ اُن کی اس بندہ پروری پر بہت خوش ہوئے وہ تو دو منٹ بعد اندر چلے گئے۔ یہ اسسٹنٹ کنٹرولر کے خاص برآمدے میں بیٹھے خاص اُن کے دعوت دینے پر چائے پیتے رہے اور بچے کھچے ٹوسٹ بھی اُڑا گئے۔

اِس طرح اسسٹنٹ کنٹرولر سے اُن کے مراسم بڑھتے جا رہے تھے۔ ایک روز اسی محلے میں نئے راشن کارڈ بٹنے والے تھے۔ علیحدہ علیحدہ گلیوں

میں ہر انسپکٹر کو ایک ایک بیٹھک بٹھا دیا گیا۔ ان کی مدد کے لئے تین تین چار چار کلرک بھی اُن کے ہمراہ تھے۔ انسپکٹر رامجی داس کو جو جگہ ملی وہ اسسٹنٹ کنٹرولر کی کوٹھی کے عین قریب تھی۔ یہ وہاں بڑے زور شور سے کارڈ بانٹتے رہے۔ چلاتے چلاتے گلا بیٹھ گیا۔ دم پھولنے لگا...... اتنے میں اسسٹنٹ کنٹرولر کا نوکر آیا اور کہا صاحب آپ کو بلاتے ہیں۔

یہ سن کر انسپکٹر رامجی داس ہکا بکا رہ گئے" ارے مجھے ......؟ ...... واقعی؟"

"ہاں جی انسپکٹر رامجی داس کو "

وہ فوراً بھاگا بھاگا وارڈ افسر کی اجازت لینے گیا۔ اور جب اُس نے بتایا کہ اُسے اسسٹنٹ کنٹرولر نے بلایا ہے تو فخر سے اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔

وارڈ افسر کو اجازت دیئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا...... یہ فوراً بھاگم بھاگ بڑے صاحب کی کوٹھی پر پہنچے۔ بڑے صاحب اُس وقت کار پر کہیں جا رہے تھے رامجی داس نے قریب پہنچ کر بڑے سعادتمندانہ طریقہ سے خوب جُھک کر سلام کیا۔

اسسٹنٹ کنٹرولر نے سر کے اشارے سے جواب دیا اور فرمایا" دیکھو رامجی داس! میں نے دلکشا سے مختلف قسم کے پھولوں کے چند گملے منگوائے ہیں، ذرا ٹھیلے والوں کے ساتھ جا کر اس پرچے کے مطابق سب گملے ٹھیلے پر لدوا کر احتیاط سے ہمارے ہاں پہنچا دینا۔ ہم ذرا باہر جا رہے ہیں......"

انسپکٹر رامجی داس نے خوب گھگھیا کر دانت دیئے اور ممیا کر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اسسٹنٹ کنٹرولر کار میں بیٹھ کر چل دیئے۔

اسسٹنٹ کنٹرولر کی عمر اس وقت پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ چہرے سے خشونت اور لالچ کے آثار ہویدا تھے۔ اس وقت خوب اچھی طرح شیو کر چکے تھے۔

کوشش کی اُس نے چند اہم ہستیوں کو چائے پر بھی مدعو کیا۔ چار پارٹی کے موقع پر وہ بڑی چرب زبانی سے باتیں کرتا رہا۔ حاضرین کے مزاج اور ذوق کو مدنظر رکھتے ہوئے اُس نے ہنسی مذاق کر کے مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ باتوں باتوں میں اُن کے خیالات کی حمایت بھی کرتا رہا۔

کانفرنس ہوتی رہی۔ وزیر صاحب بھی تھالی کے بینگن کی طرح اِدھر اُدھر لڑھکتے رہے۔ کبھی خوش ہو جاتے اور کبھی مایوس۔

اُنھوں نے کانگریس پارٹی کا زور دیکھا تو اُن کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ آخر اِس میں ہرج بھی کیا تھا۔

کانگریس کے ایک بڑے لیڈر کی پریس کانفرنس میں یہ بھی جا دھمکے۔ یہ ذرا ایک طرف کو کھڑے ہوئے تھے۔ جب وہ لیڈر بات کہتا کہتا ان کی طرف رُخ کرتا یہ گھگھیا کر دانت دکھا دیتے اور پھر جو بھی یہ مسکرا کر کچھ کہنے لگتے اتفاق سے بے خیالی میں لیڈر دوسری طرف رُخ پھیر لیتا۔

۔۔۔۔۔۔

کسک

دس برس ڈاکخانے کی نوکری کرنے کے بعد تنگ آکر اُس نے ملازمت کو خیر باد کہہ دیا...... اُسے ان دنوں ایک خواب دکھائی دیا کہ وہ کسی طرف چلا جا رہا ہے۔ چلتے چلتے اُس کی نظر اپنے بوٹوں پر جا پڑی۔ دیکھتا کیا ہے کہ اُس کے بوٹوں پر لگی ہوئی کیچڑ خود بخود جھڑ کر پرے جا گرتی ہے اور اُس کے بوٹ خوب چمکنے لگتے ہیں........ اُس نے اِسے اچھا شگون سمجھا۔ اور پھر پرماتما کا کرنا دیکھئے کہ اِس واقعہ کے بعد تین سال کے اندر اندر اُس کی مالی حالت مستحکم ہو گئی۔ پہلے وہ شہر میں رہتا تھا۔ وہاں اُس کا آبائی مکان تھا۔ لیکن نہ وہ مکان اچھا تھا نہ وہ محلہ ہی اُسے پسند تھا۔ اب چونکہ وہ پہلے کی بہ نسبت زیادہ اخراجات کا متحمل ہو سکتا تھا اُس نے سوچا کہ آبائی مکان کو کرایہ پہ اُٹھا دے ماہانہ کرایہ میں اپنی جیب سے کچھ روپیہ ملا کر اس قدر رقم ہو سکتی تھی کہ وہ سول لائنز میں بہتر مکان لے سکے۔

جب پرماتما کام سنوارنے پر آئے تو پھر ادھر انسان کوئی اسکیم سوچتا ہے اور اُدھر اُس کا کام بننے لگتا ہے۔ انھیں دنوں اُسے ایک چھوٹا بنگلہ بھی مل گیا۔

اگرچہ یہ سول لائنز کے سرے پر تھا۔ لیکن رہائش کے لئے اچھی خوبصورت اور پُر فضا جگہ تھی۔

غرض اب وہ زندگی کی اس قسم کی چھوٹی موٹی سہولتیں حاصل کرنے کے قابل ہوگیا تھا۔ یہ دُرست ہے کہ وہ اب تک روپیہ جمع نہ کر پایا تھا۔ لیکن پہلے کی نسبت اب آرام سے کٹ رہی تھی۔ رہنے کے لئے اچھی جگہ حاصل ہوگئی تھی۔ روپیہ کمانے کے لئے پہلے کی طرح کولھو کا بیل بن کر صبح سے شام تک قلم گھسنے کی اور افسروں کی جھڑکیاں سہنے کی ضرورت نہ رہی تھی۔

اس کا بنگلہ چھوٹا سہی لیکن خوبصورت ضرور تھا۔ نیا ہی بنا تھا۔ بنگلے کے اردگرد باڑ تھی اور یوکلپٹس کے پیڑ۔ بنگلے میں وہ اپنی بیوی اور چار بچوں کے ساتھ زندگی کے دن آرام سے کاٹ رہا تھا۔ یوں تو انسان کی حرص کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ لیکن بظاہر کوئی ایسی بات نہ تھی جو اس کے لئے پریشان کن ثابت ہوتی۔

اٹھائیس برس کی عمر میں اُس نے نوکری چھوڑ دی۔ چار برس اوپر گزر گئے تھے۔۔۔ اُس کی شادی سولہ برس کی عمر ہی میں ہوگئی تھی۔ بیوی دو ڈھائی برس چھوٹی تھی۔ اِس وقت اُسے عورت کی خوبصورتی، رعنائی اور عشق وغیرہ کا خیال نہ تھا۔ بس عورت تھی یہ بات اُس کے لئے کافی تھی۔ جونہی اس نے ہوش سنبھالا اُسے ایک عورت مل گئی۔ وہ اُس کی بیوی تھی۔ اگرچہ وہ حسین تھی لیکن اُس نے کبھی یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ وہ حسین تھی یا بدصورت اُس کے لئے صرف ایک ہی بات کی اہمیت تھی۔ وہ جوان تھا اور اُس کی بیوی ایک عورت تھی۔ اُس نے دادِ عیش دی۔ دن ہو یا رات جب وقت ملتا وہ اپنی بیوی کو دبوچ لیتا۔ بس زندگی میں یہی دو کام تھے نوکری اور بیوی۔

عورت نے بچے دینے شروع کئے کوئی زندہ رہتا کوئی مرجاتا۔ اُسے اس بات کی کوئی فکر نہ تھی۔ بچہ مرتا ہے مرے جیتا ہے تو جئے۔ لیکن اُس کی بیوی سلامت رہنی چاہیئے۔ اب تو خیر اُسے اپنے بچوں سے محبت ہو گئی تھی۔ لیکن اُن دنوں اُسے یہ بچے عجیب مخلوق معلوم ہوتے تھے۔ وہ سوچا کرتا تھا کہ نہ معلوم یہ نیلے پیلے لجلجے بچے کہاں سے ٹپک پڑتے ہیں۔ اِس کے علاوہ اُسے اپنی بیوی کی زرخیزی پر غصہ آتا تھا۔ ہر سال ایک بچہ۔ کمبخت بھری بیٹھی رہتی ہے بس ذرا ہاتھ سے چھو دو جھٹ ایک جیتا جاگتا، روتا ہنستا، پلپلا، لجلجا بچہ اُگل دیتی ہے۔ کبھی کبھار وہ کسی بے تکلف دوست سے کہتا یار! قدرت کے لئے یہ بات ناممکن تو نہ تھی اگر عورتیں بھی بچوں کے بجائے انڈے دینے لگتیں۔ سوچو اُستاد۔ ہوتی نہ مزے کی بات۔ اگر حمل قرار پا جاتا عورت مزے میں ایک انڈا دے دیتی۔ ناحق کی پریشانی سے تو بچے رہتے میاں بیوی۔

دیکھنے میں وہ دبلا پتلا شخص تھا۔ لیکن عورت کی بھوک اِس قدر زیادہ تھی کہ مٹائے نہ مٹتی تھی۔ وہ شاعروں کی طرح عورت کی نزاکت اور رعنائی کا قائل نہ تھا۔ اُس کے نزدیک عورت ایک ٹھوس شے تھی۔ وہ ایسی عورت چاہتا تھا جس کے جسم پر مضبوط اور ٹھوس گوشت ہو۔ کس بل ہو اور حیوانیت ہو جو مرد سے ٹکرا جائے ...... اُسے جھینپتی، شرماتی، لچکتی، بل کھاتی، نازک اندام عورتیں پسند نہیں تھیں۔

اُس نے اپنا نفسیاتی تجزیہ کبھی نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ باتیں وہ وجدانی طور پر محسوس کرتا تھا۔ اب جوں جوں اُس کی زندگی آرام دہ ہوتی جارہی تھی توں توں اُس کا یہ احساس واضح ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جس طرح پیاس محسوس کرتا تھا جس طرح اُس کے پیٹ کو روٹی کی طلب ہوتی تھی یا جس طرح

اور قدرتی اشیاء کی انسان کو احتیاج ہوتی ہے اسی طرح اُسے عورت کی بھوک تھی۔ وہ حیران تھا کہ اب تک اپنی ازدواجی زندگی میں بھی وہ زیادہ محتاط نہ رہا تھا اِس کے باوجود اُس کی یہ اشتہار ورِادل کی طرح باقی تھی۔

ہر چند اُس نے اپنی بیوی کے جسم کا پورا پورا فائدہ اُٹھایا تھا۔ لیکن جس طرح برف کا پانی خواہ کتنا بھی کیوں نہ پیا جائے تشنگی دور نہیں ہوتی اِسی طرح وہ انجانے طور پر بے چین سا رہتا تھا۔ اُس کا جسم سر سے پاؤں تک جلا کرتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں کے حوالے کر دینا چاہتا تھا تاکہ آگ میں آگ مل جائے۔

بنگلے کا ایک کمرہ اُس نے اپنے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ یہ کمرہ ایک کنارے پر تھا۔ سجاوٹ کا کوئی خاص سامان اُس کے اندر موجود نہ تھا لیکن اس کے باوجود کمرے کی اپنی خوبیاں بھی تھیں۔ ایک تو یہ بہت کشادہ تھا۔ اور پھر ہوادار تھا۔ صوفوں کا ایک سیٹ۔ ایک گوشہ میں میز۔ دوسرے کونے میں کتابوں کی دو الماریاں۔ فرش پر دری۔ بڑی بڑی کھڑکیوں کے شیشوں پر ہلکے سبز رنگ کی جالی۔ بس اِس کے علاوہ وہاں کچھ نہ تھا۔ کمرے کے آگے گھاس کا ایک پلاٹ تھا۔ اُس کے آگے باڑ اور یوکلپٹس کے پیڑ۔ باڑ کے آگے سے ایک سڑک گزرتی تھی جو چکر کھا کر سول لائنز کی گھنی آبادی میں داخل ہو جاتی تھی۔ سڑک کے آگے ایک میدان تھا۔ میدان کے پرلی طرف زمین میں طویل و عریض گڑھے کھُدے ہوئے تھے۔ وہاں کمہار مٹی لینے کے لئے جایا کرتے تھے۔ اِن گڑھوں سے بھی پرے کھیتوں کے سلسلے شروع ہو جاتے تھے۔

دوپہر کے وقت وہ آرام کرسی پر پاؤں پھیلا کر نیم دراز ہو جاتا اور سگریٹ کا دھواں اُڑاتے ہوتے نیم باز آنکھوں سے میدان کی طرف دیکھا کرتا تھا جہاں

چلچلاتی دھوپ میں بھنگے سے اُڑتے دکھائی دیا کرتے تھے۔ اندر کے کمرے سے بچوں کا شور اور اُس کی بیوی کی جھڑکنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ اگر ایک بجے کا وقت ہوتا تو ریڈیو پر ریکارڈ بجنے لگتے۔

اسی طرح ایک دن دوپہر کے وقت وہ آرام کر رہا تھا۔ کھڑکی میں سے چلچلاتی دھوپ میں اُفق کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جہاں اُفق کی لکیر سطح آب کی طرح متحرک سی نظر آتی تھی ـــــ اتنے میں اُس کی بیوی اندر داخل ہوئی۔

"اجی! .... اجی کہاں ہو؟"

اس نے سر گھما کر اُس کی طرف دیکھا۔ بیوی نے دُور ہی ہاتھ سے قریب آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "ادھر آئیے جی.... آپ کو ایک چیز دکھائیں"۔ اس وقت اُس کی بیوی کسی پانچ سالہ بچی کی طرح معصوم نظر آتی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں تجسس اور ہونٹوں پر بچپن کی شوخی جھلکتی نظر آتی تھی۔ سر پہ کپڑا تک نہ تھا۔ دوپٹہ کندھوں پر لٹک رہا تھا۔ قمیص کا باریک کپڑا پسینہ کی وجہ سے جسم سے چپک گیا تھا۔ اُس نے اُٹھ کر اُس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اور ہونٹ چوم کر پوچھا "کیا دکھائیے گا؟"

شرم کے مارے بیوی کے چہرے پر سرخی آگئی۔ وہ اب بھی شرما جاتی تھی۔ بھلا اب جبکہ شادی کو سولہ برس ہو چکے تھے۔ شرمانے کی کیا ضرورت تھی شاید اس لئے کہ وہ دیہات کی رہنے والی تھی۔ وہ ان باتوں کو بے شرمی ہی سے تعبیر کرتی تھی۔ جاہل! لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ یہ اُسی عورت کا دم تھا کہ اتنے بچے دینے کے بعد بھی اس میں دلکشی باقی تھی۔

بعض حقیر ترین واقعات سے ہمارے جذبات کچھ اس طرح وابستہ ہوتے ہیں کہ ہم ان واقعات کو حد سے بڑھ کر اہمیت دے دیتے ہیں۔ اُسے وہ دن

اچھی طرح یاد تھا جب اُس کی بیوی اُسے "ایک چیز" دکھانے کے لیے بلا کر لے گئی تھی اور وہ "ایک چیز" کیا تھی ؟ ۔۔۔ ایک کتا۔ کوئی مہتر لایا تھا۔ چھوٹا سا فاکس ٹیریر کی نسل کا یہ خوبصورت کتا دیکھ کر اُس کے بچے مچل گئے تھے۔ اور بیوی کہتی تھی کہ شوہر رات کو دیر دیر سے گھر آتے ہیں تنہا بنگلہ ہے کتا ہوگا تو رکھوالی ہی کرے گا۔

وہ اُکڑوں بیٹھ کر کتے کو بغور دیکھنے لگا۔ یہ چھوٹا سا کتا جس کی چار انگل لمبی زبان منہ سے باہر لٹک رہی تھی۔ گھر کی کیا رکھوالی کرے گا۔ وہ مہتر معلوم اُسے کہاں سے اُڑا لایا تھا۔ بہت زیادہ دام مانگتا تھا۔ لیکن جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ یہ فضول خرچی بھی اتفاق رائے سے منظور کر لی گئی۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ وہ جانتا تھا کہ چونکہ اُن کے دست مچندہ کے یہاں کتا ہے۔ اِس لئے اُس کی بیوی بھی امارت کی اس علامت کو ظاہر کرنا چاہتی تھی۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ حالانکہ یہ فضول خرچی تھی۔ اسی طرح کی فضول خرچی جیسی اُنھوں نے کوچ کا سیٹ خریدتے وقت کی تھی۔

یہی وہ کتا تھا جسے اپنے ہمراہ لے کر وہ کھیتوں کی طرف نکل جایا کرتا تھا۔ ۔ ایک مرتبہ جب وہ شام کے وقت حسب معمول سیر پہ جانے لگا۔ تو باڑ پھاندتے ہوئے اُس کی پتلون کا پائنچہ کانٹوں میں پھنس گیا۔ وہ اُسے چھڑانے لگا اور کتا پاس کھڑا دُم ہلا ہلا کر بھو نکنے لگا۔ جب اُس نے پائنچہ کانٹوں کی گرفت سے آزاد کر لیا تو دیکھا کہ سڑک پہ ایک عورت کھڑی ہے۔

وہ اُس کے کتے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید اُسے یہ کتا پسند تھا۔ اُس نے پوچھا " یہ کتا آپ کا ہے ؟"

"جی ہاں"
اُس نے عورت کی طرف نظر بھر کر دیکھا۔ وہ کالج کی چنچل لڑکی نہ تھی۔ نہ وہ نازک اندام اور محشر خرام تھی۔ نہ وہ شرمیلی تھی اور نہ اُس کی جھکی جھکی نظریں تھیں۔ نہ وہ بے حیا تھی نہ وہ بے باک تھی۔ بس وہ ایک عورت تھی سلجھی ہوئی۔ ٹھہری ہوئی ـــــ اُس کے گورے بھرپور ہاتھوں کو دیکھ کر وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ اُس کی شوخ رنگ کی شلوار کے اندر اُس کی ٹانگیں کیسی ہونگی۔ اُس کی عمر پچیس چھبیس برس کے لگ بھگ ہو گی۔ آنکھیں مدبھری۔ اُس کے چہرے پر اُس کی بیوی کی طرح احمقانہ بھولاپن نہ تھا۔ اُس کا جسم تازہ سجے ہوئے دسترخوان کی طرح تھا جس کی خوشبو سونگھ کر انسان کی اشتہا تیز ہو جاتی ہے۔ وہ اچھی طرح پکے ہوئے پراٹھے کی طرح تھی۔ جو نہ جلا ہوا تھا نہ نیم پختہ تھا۔ جس ٹھوس گوشت کی اُسے بھوک محسوس ہوا کرتی تھی وہ اُس کے سامنے تھا۔

عورت نے اُس سے آنکھیں ملا کر کہا۔ "بڑا پیارا کتا ہے ...... میں چھو لوں؟ کاٹے گا تو نہیں؟"

"جی نہیں" اُس نے ہنس کر کہا "گھر میں چور یا ڈاکو بھی آن گھسیں تو یہ اُنھیں نہ کاٹ سکے ......"

وہ ہنس پڑی .... یہ شرمیلی ہنسی نہ تھی۔ نہ بیباک ہنسی تھی۔

جب تک وہ کتے کے جسم پر اپنا خوبصورت ہاتھ پھیرتی رہی وہ اُس کے جسم کی طرف دیکھ دیکھ کر اس کا جائزہ لیتا رہا۔ عورت باتیں بھی کرتی رہی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ اُس کی طرف تعریف کی بلکہ حریص نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن وہ بالکل پریشان نہیں ہوئی نہ جھینپی نہ خفا ہوئی ...... اور جب وہ

کھڑی ہو کر پیچھے کی طرف سر گھما کر دوپٹے کے گرد آلود کونے کو جھاڑنے لگی تو اُس کی کمر میں ایک دلنشین خم پیدا ہو گیا تھا۔ چھاتیاں اور بھی آگے کو اُبھر آئیں شلوار کے بل نیچے کو گر گئے اور کپڑا جلد کو جا لگا اور اُس کی ایک ران کی گولائی اور متناسب بناوٹ عیاں ہو گئی........ پھر وہ سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس نے دوپٹہ کو معمولی طور پر سنوارا.......... اور ہنستے ہوئے بولی "اچھا........ شکریہ !"

عورت چلدی اور وہ کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ اتنے میں سورج غروب ہو رہا تھا۔ داہنے ہاتھ کی طرف وسیع پھیلے ہوئے کھیت پیلے رنگ میں رنگے گئے۔ اور وہ عورت اس تپتیا سنسان سڑک پر چلی جا رہی تھی۔ کبھی کبھار بائیں ہاتھ کو بنی ہوئی کوٹھیوں میں سے کتے باہر نکل کر یونہی بلا کسی مقصد کے بھونکنے لگتے۔ سورج کی روشنی میں اُس کی زعفرانی رنگ کی گھٹنوں تک لٹکتی ہوئی قمیص اور بھڑکدار دوپٹہ جگمگا اُٹھا۔ دُور سے وہ ایک لپکتے ہوئے شعلے کی طرح نظر آ رہی تھی۔

اُس کے دل میں اُتھل پیدا ہو گئی۔ اُس دن وہ بہت دُور تک سیر کرتا ہوا چلا گیا۔

زندگی میں یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ نیا خیال اور نیا ہی سرور تھا۔ آج تک اُس نے کبھی کسی غیر عورت کی طرف آنکھ بھر کر دیکھنے کی جرأت نہ کی تھی۔ لیکن آج اُس نے اس عورت کو جی بھر کر دیکھا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ اس کا دل بھر گیا تھا۔ اب تو اُس کے دل میں ایک خلا پیدا ہو گیا تھا۔ دل کرب و مسرت کے مِلے جلے جذبات کے بحران میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اُس کے دل میں اِس عورت کے لئے بے پناہ چاہت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اُس عورت سے انجانے طور پر روزِ ازل سے محبت کرتا چلا آ رہا تھا اور

ابد تک کرتا چلا جائے گا۔ ایک نیا سورج طلوع ہونے کو تھا۔ امنگوں اور ترنگوں کی نئی صبح کا نور دکھائی دے رہا تھا۔

وہ گھر واپس آیا تو یونہی خوش خوش نظر آ رہا تھا۔ بیوی بھی اُسے دیکھ کر حیران ہو رہی تھی کہ آخر وہ آج اِس قدر خوش کیوں تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ ریڈیو کے پاس بیٹھا بچوں سے ہنستا کھیلتا رہا۔

دوسرے دن اُس کا اِدھر اُدھر کے کاموں میں دل ہی نہ لگا۔ وہ کھلنڈرے بچے کی طرح اِدھر اُدھر لاپرواہی سے گھومتا رہا۔ پھر اُس نے اپنے دل کو ٹٹولا کہ وہ خوش کیوں تھا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ اُس اجنبی عورت سے راہ و رسم پیدا ہو جائے۔ کیا وہ پھر کبھی آئے گی۔ اِس خیال سے اُس کا دل اُداس ہو گیا۔ اِس بات کی کیا گارنٹی تھی کہ وہ عورت آج پھر اِدھر سے گزرے گی .... لیکن وہ سرِ شام ہی اُس کی راہ دیکھنے لگا۔ وہ پارک کے قریب کتے کو پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہاں سے وہ اُس عورت کو دُور ہی سے دیکھ سکتا تھا .... اُس کی آنکھیں سڑک پر بچھی ہوئی تھیں۔ لیکن کمہاروں کے گدھوں کے سوا سڑک پر کوئی متنفس نظر نہ آتا تھا۔ امید و بیم کی حالت میں وہ جگر تھامے بیٹھا رہا .... معاً اُس نے اُنھیں کپڑوں کی جھلک دیکھی .... کیا وہ تھی؟ ..... وہی تھی۔ اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ ذرا پرے ہٹ کر کتے کو ساتھ لئے ہوئے اُسی انداز سے عین موقع پر اُس کے سامنے پہنچ گیا۔

عورت نے پھر کتے کی طرف دیکھا۔ سیٹی بجا کر اُسے بلایا۔ وہ بھی قریب جا کھڑا ہوا۔ پہلے روز کی طرح وہ اُس کی طرف دیکھتا رہا .... کتا عورت کے ہاتھوں سے کھیلتا رہا۔ عورت ہنستی رہی۔ پھر اُس نے

اُس کی طرف دیکھ کر دلفریب ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ کا یہ کتا تو واقعی بہت پیارا جانور ہے۔

"جی ہاں، اتفاق سے ہاتھ لگ گیا۔ ورنہ آپ جانتی ہیں اچھی نسل کا جانور بڑی مشکل سے حاصل ہوتا ہے۔"

عورت نے اپنے بُندوں کو چھو کر کہا۔ اِس کا شجرۂ نسب آپ کے پاس موجود ہے؟....."

"جی ہاں! میرے پاس موجود ہے۔ یہ خالص فاکس ٹیریر.... ... دراصل اِسی قسم کی ہے۔ بس ذرا پیار کرنے کے لئے رکھ لیا جاتا ہے ...."

عورت نے جواب میں اِس طرح سر ہلایا جیسے وہ اس کی نسبت اِن معاملات کو زیادہ اچھی طرح سمجھتی ہو۔

پھر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ آگے روانہ ہو گئی۔

وہ اُسے دیکھتا رہا۔ اُس نے پہلے روز والے بھڑکدار کپڑے پہن رکھے تھے۔ دوڑ دھوپ میں اُس کا لباس پہلے روز کی طرح جگمگا رہا تھا۔

وہ آئی اور گزر بھی گئی۔ وہ اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کا دل سینے کی قید سے آزاد ہو جانا چاہتا تھا۔ آج وہ کل سے بھی زیادہ دلفریب نظر آ رہی تھی۔ بعض عورتوں کی آنکھیں خوبصورت ہوتی ہیں۔ بعض کے ہاتھ۔ بعض کے ہونٹ۔ بعض کی ادائیں۔ لیکن اس کے لئے اس عورت کا پورے کا پورا جسم سر سے پاؤں تک کشش کا باعث تھا۔ وہ اس مکمل جسم کے لمس کا خواہاں تھا۔ اسے وہ صحیح قسم کی عورت دکھائی دی۔

جس کے لئے اُس کا دل ہمیشہ تڑپا کرتا تھا۔ اُس کی اشتہا اِس قدر سچی اور قدرتی تھی کہ اُسے لمحہ بھر کے لئے بھی یہ خیال نہ آیا کہ وہ ایک غلط راستے پر چل رہا تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ یہ راستہ پُرخار ہے۔ لیکن یہ کہ اس رستے پر چلنا اخلاقی اور سماجی نقطۂ نظر سے معیوب تھا وہ نہیں جانتا تھا۔ بلکہ وہ اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوا۔ حالانکہ اب اُس کی عمر تیئیس ۲۳ برس سے تجاوز کر چکی تھی، لیکن وہ عورتوں کے معاملہ میں ہمیشہ شرمیلا ہی رہا۔ صرف اُس کی بیوی ہی وہ عورت تھی جس سے وہ بیباکی سے پیش آتا تھا۔ لیکن غیر عورت کے سامنے وہ آنکھ نہ اُٹھا سکتا تھا۔ یہ ایک حیرت انگیز بات تھی کہ جو شخص اپنے دل میں بھڑکتی ہوئی آگ لئے پھرتا تھا اُس کے سامنے جب کبھی کوئی نوجوان لڑکی یا عورت آجاتی تو اُس کے ہاتھ پاؤں پھُول جاتے۔ زبان لڑکھڑانے لگتی۔ شاید اُسے یہ خیال تھا کہ کہیں کوئی عورت اُس کے دل کی کیفیت کو بھانپ نہ لے۔ اور شاید اُسے اپنے آپ پر بھروسہ نہیں تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اُس کا راز اُس کی صورت ہی سے افشا ہو جائے گا۔ فلاں اُس کی سالی تھی۔ پرماتما نہ کرے اگر وہ دیکھ پائے تو کیا کہے۔ فلاں اُس کی موسیی تھی اگر اُسے اس پر شبہ گزرے تو وہ کیا سمجھے۔ فلاں اُس کی بیوی کی سہیلی یا اُس کے دوست کی بیوی تھی اگر وہ اُس کے دل کا حال جان جائے تو نہ معلوم کیا ہو۔ اگر کبھی عورتوں کے جگمٹے میں بیٹھ جاتا تو نئی نویلی دُلھن کی طرح زمین کی طرف ہی دیکھتا رہتا۔ وہ دل میں کئی عورتوں کی قدر کرتا تھا اُنھیں پسند کرتا تھا۔ وہ اُن کے حسن کا معترف تھا لیکن وہ یہ راز ظاہر کرنے سے ڈرتا تھا اور یہ راز ظاہر کرنے کے لئے اُسے منہ کھولنے کی بھی کچھ ضرورت نہ تھی بس اُس کی آنکھیں اور اُس کے دیکھنے کا انداز ہی کافی تھا۔۔۔۔

یہ پہلی عورت تھی جس کے سامنے وہ نہیں شرمایا۔ اُسے یہ سب کچھ اس قدر قدرتی نظر آنے لگا۔ وہ عورت اِس قدر مکمل عورت تھی۔ اُس کا عورت پن اِس قدر ہمہ گیر تھا۔ وہ اپنے عورت ہونے سے اِس قدر مکمل طور پر آگاہ تھی۔ مرد کا اُس کے جسم کے نظارے یا لمس سے لطف اندوز ہونا اس کے لئے ایک فطری بات تھی۔ مردکا اُس پر نچھاور ہونے پر آمادگی ظاہر کرنا اُس کے لئے کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ جس طرح سڑک کو اپنے سینے پر قدم جما جما کر چلنے والوں سے کوئی شکایت نہ تھی۔ اسی طرح اس عورت کو بحیثیت عورت کے کسی مرد سے بحیثیت ایک مرد کے کوئی شکایت نہ تھی۔ وہ مرد کے لئے پیدا ہوئی تھی۔ اُس نے مرد کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر چلنے کے لئے جنم لیا تھا۔

دنیا میں قدرت نے صرف ایک عورت کیوں پیدا کی تھی۔ باقی نام نہاد عورتیں، عورتوں کے روپ میں درحقیقت کیا تھیں؟

وہ اِس عورت کی عظمت کا اِسی طرح قائل تھا جس طرح آسمان میں چمکنے والے سورج کا۔ جس طرح آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے ستاروں میں مسکرانے والے چاند کا، جس طرح روح کو تازگی بخشنے والی فراٹے بھرتی ہوئی ہوا کا۔ جس طرح ہرا دیکھے نیچے ٹیلے، مخمل اور جھونپڑے پر برسنے والی بارش کا۔ وہی اصلی عورت تھی جو صبح ازل سے خراماں تھی۔ وہی اُس کی بیوی تھی جسے وہ اپنی رانوں پر بٹھا کر اُس کے جسم سے بے پناہ لذت حاصل کرسکتا تھا۔ وہی اُس کی ماں تھی جس کی گود میں منہ چھپا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو سکتا تھا۔ وہی اُس کی بہن تھی جس کی اُنگلیوں کے لمس سے ابدی مسرت اور سکون کا احساس اُس کے جسم کے روئیں روئیں کو محسوس ہونے لگتا تھا۔ وہی

اُس کی بیٹی تھی جس کی پیشانی پر ہونٹ رکھ کر وہ شفقت پدری کے مزے لوٹ سکتا تھا..... وہ عورت اُس کے لئے سب کچھ تھی۔ انسانی وجود میں سمٹ کر بھی وہ کائناتِ عالم میں پھیلی ہوئی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس عورت کو پالینا اس کے بس کی بات نہیں۔ جس طرح قطرے کے لئے سمندر کو اپنے اندر کھپا لینا ناممکن تھا۔ وہ کبھی بھی اس عورت کو تھام نہ سکتا تھا۔ وہ کبھی اسے اپنے بازوؤں میں نہ جکڑ سکتا تھا۔ البتہ وہ خود اس میں گم ہو سکتا تھا۔ اس کے دل میں ایسی جلن اور دماغ میں ایسی بھڑک تھی کہ وہ اپنے آپ کو مٹا دینا چاہتا تھا۔ اس عورت کو دیکھ کر وہ اپنے جذبات کا جائزہ لے سکتا تھا۔ کیا وہ اُسے زبردستی اُٹھا کر کھیت میں جا گھُسے اور اُسے کھُردری زمین پر لٹا دے۔ یا آنکھوں میں آنسو بھر کر اُس کے پاؤں چھو لے۔ یا اُس کا ہاتھ تھام کر وہ دونوں اکٹھے نہر پر چلے جائیں جہاں وہ ریت کے گھروندے بنا بنا کر کھیلیں یا وہ اُس کی پیشانی چوم کر اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرے۔

اُس کا دماغ اِس ذہنی کشمکش کا حل سوچنے سے بالکل قاصر تھا۔ وہ کیچڑ میں دبے ہوئے مینڈک کی طرح اتنے عرصہ تک بالکل خاموش رہا۔ لاوا اندر ہی اندر اُبال کھاتا رہا۔ اب وہ بہہ نکلا۔ کیا سورج کبھی پہاڑ کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اُس کے اندر سے اُبل اُبل کر باہر آنے والے لاوے کو روکا جا سکتا ہے۔ اجنبی عورت نے گویا ایک نشتر سے اس پکے ہوئے پھوڑے کو چیر ڈالا تھا۔ وہ درد کے مارے چیخ اُٹھا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک ناقابلِ بیان راحت بھی نس نس میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔ کھنچے اور دُکھے ہوئے اعصاب کو سکون حاصل ہو رہا تھا۔ نشتر کے مس پر وہ مارے کرب کے وہ تڑپ بھی اُٹھتا تھا۔ لیکن وہ اس کی زد سے باہر بھی

نہیں رہنا چاہتا تھا......... اُسے اِس قدر تسکین ہو رہی تھی۔
اُسے آج واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ وہ کیوں اِس وسیع دنیا میں کھویا کھویا سا گھوما کرتا تھا۔ وہ کون سی پکار تھی جو اُسے شور و غل میں سُنائی دیا کرتی تھی۔ وہ کیوں ہر راہرو کے ساتھ کچھ دُور تک بے اختیار بھاگا چلا جایا کرتا تھا۔۔۔۔ لیکن یہ حالت بے چینی اور کرب کی تھی۔ سکون ایسا ہی تھا جیسے گرمیوں کے دنوں میں تیز و تند جھلس دینے والی لُوؤں میں سرد ہوا کا کوئی جھونکا۔ انسان کی تپتی ہوئی پیشانی اور کانوں کو چھو کر نکل جائے۔
ہر روز شام کے وقت وہ خط بنا کر صاف ستھرے کپڑے پہن لیتا اور پھر کتے کو ساتھ لے کر باہر نکل جاتا۔ کبھی سڑک پر گھومتا۔ کبھی ذرا کھیتوں کی طرف نکل جاتا۔ کبھی اپنی بارک کے اسی طرف ٹہلتا....... لیکن اُس کی نگاہیں اُسی طرف جمی رہتیں جس طرف سے وہ عورت آیا کرتی تھی۔ وہ نت نئے کپڑے پہنتی۔ ایک تو اُسے کپڑے پہننے کا سلیقہ تھا اور پھر وہ غضب کی جاذبِ نظر عورت تھی۔ اُس کے جسم پر ہر قسم کا لباس کھل جاتا تھا۔ جو لباس اُس کے جسم کو چھو لیتا اُس کی خوبصورتی اور کشش دُگنی ہو جاتی۔
وہ ہر روز اُسے دیکھا کرتا تھا۔ ہر مرتبہ وہ تہیہ کرتا تھا کہ وہ اُس سے بات چیت کرے گا۔ لیکن جب وہ سامنے آتی تو وہ کچھ نہ کہہ پاتا۔ اِس کی وجہ رُعبِ حسن نہ تھا بلکہ کچھ اور ہی کیفیت تھی جسے وہ خود نہ سمجھتا تھا۔ مثلاً وہ اُس سے کیا بات کہے۔ کیا وہ یہ کہے کہ اگر اُسے کتا پسند ہو تو وہ لے لے لیکن اس کی کوئی وجہ ہونی چاہیئے۔ آخر ایک عورت اِس طرح بلا کسی تعلق کے کتے لینا پسند نہ کرے گی۔ وہ خواہ مخواہ نہ معلوم اُسے کیا سمجھ بیٹھے۔ اُس نے سوچا کہ عورت کو کتوں سے بہت دلچسپی ہے۔ اِس لئے اُس نے

کتوں پر چند کتابیں پڑھ ڈالیں تاکہ اگر گفتگو ہو تو وہ اُسے اپنے وسیع علم کا گرویدہ بنا سکے۔ لیکن پھر کبھی اِس موضوع پر بات ہی نہیں ہوئی۔

وہ خود حیران تھا کہ وہ اُس سے تعلقات پیدا کرنے سے قاصر کیوں تھا۔ عورت کا رویہ دلشکن ہرگز نہ تھا۔ اِس قدر بے باکی سے اُس نے آج تک کسی عورت کی طرف نہ دیکھا تھا۔ لیکن اِس کے باوجود عورت کے ماتھے پر کبھی کوئی شکن نہ دکھائی دی۔ اگر وہ اس سے کوئی بات کہتا تو ہنس کر جواب دیتی۔ لیکن وہ زیادہ دیر تک گفتگو کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکتا تھا۔ چنانچہ اِن دونوں کے درمیان ایک بے معنی سی خاموشی طاری ہو جاتی تو عورت چپ چاپ آگے بڑھ جاتی۔ وہ اُسے دیکھتا رہ جاتا۔ یہانتک کہ وہ موڑ پہ گھوم کر غائب ہو جاتی۔

اُس کا پہلا شدید احساس زائل ہوتا جارہا تھا۔ اُس عورت کی طرف دیکھنا، اُس کے دلکش جسم پہ نظریں دَوڑانا اُسے اِس قدر فطری معلوم ہوتا تھا جیسے یہ اُس کا دائمی حق تھا۔ جسے عورت کی خفگی بھی نہیں چھین سکتی تھی۔ بلکہ اُسے یوں محسوس ہوا تھا کہ اگر وہ اُسے سڑک پر کھڑے کھڑے اپنی چھاتی سے لپٹا کر اُس کے بوسے بھی لے لے تو یہ بھی ایک قدرتی بات ہوتی۔ یہ ایک عجیب جذبہ تھا جو کسی عورت کو دیکھ کر اُس کے دل میں پیدا نہ ہوا تھا صرف یہی ایک عورت تھی جسے دیکھ کر اُس کے ذہن میں اِس قدر صحت ور جنسی جذبہ پیدا ہوا۔ بلکہ اِس عورت نے بوتل کے جن کی طرح پھیل کر اُس کے خیالات کو پَر لگا دئے تھے اور وہ چشم زدن میں انتہائی بلندیوں پر پہنچ گیا تھا۔ شاید یہ پہلی اُڑان سالہا سال کی پابندیوں سے نجات کے موقع پر اِس قدر رفعتوں پہ پہنچ گئی تھی۔ اور پھر خود ہی خوفزدہ

ہوگیا۔ جیسے ایک بچہ اپنی دھن میں کسی اونچے مینار پر چڑھ جائے اور پھر نیچے کی جانب دیکھے اور ڈر کے مارے رونے لگے۔ اِس طرح وہ پیچھے ہٹنے لگا۔ وہ اپنے آپ کو کمزور محسوس کرنے لگا۔ پہلے اُس نے اپنے آپ کو لعنت ملامت کی۔ اِس پر اُس کی رگِ حمیت پھڑک اُٹھی۔ لیکن وہ جوشش پھر عارضی ثابت ہوا۔ وہ دن بدن کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اپنی نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ وہ سنبھلنے کی انتہائی کوشش کر رہا تھا لیکن اُسے احساس ہوا کہ وہ اب پاؤں پر کھڑا نہیں رہ سکتا۔ اِس احساس کے ساتھ ہی اُس کی روح پر بادل سے جمع ہونے لگے۔

اُس نے عورت کی طرف دیکھا کہ شاید اُسے دھوکا ہوا ہو۔ شاید وہ درحقیقت وہ عورت نہ ہو جو اُس کو سمجھے بیٹھا تھا۔ وہ اُسے غور سے دیکھتا رہا۔ سر سے پاؤں تک۔ اُس کے جسم کا ہر عضو اُس کی حرکات و سکنات........ لیکن وہ کوئی ایسی بات نہ ڈھونڈ سکا جس کی وجہ سے اُسے اپنا پہلا خیال بدلنا پڑے۔

عورت وہی تھی۔ اُس کی عظمت بھی وہی تھی۔ اُس کا رتبہ بھی وہی تھا۔ لیکن وہ اِس قابل نہ تھا۔ وہ عورت کے قابل نہ تھا۔ وہ صرف انھیں صورتوں کے قابل رہ گیا تھا جنھیں غلطی سے عورتیں کہا جاتا تھا........ اِس خیال کے ساتھ اُس کے دل پر اور بھی گہری تاریکی چھا گئی۔ لیکن اُس نے اپنی شکست قبول کر لی تھی۔

جب وہ اپنی شکست قبول کر چکا تو عورت نے اس راستہ سے آنا چھوڑ دیا۔

اُس کے دل میں عجیب قسم کی خلش پیدا ہوئی۔ اُس کی خوراک کم

ہوگئی۔ دنیا کی چیزوں سے دلچسپی نہ رہی۔ وہ کھویا کھویا سا سڑک پر جا کھڑا ہوتا اور اُس طرف دیکھنے لگتا جدھر سے وہ عورت آتی تھی دُور کیلے کے جھنڈ کے قریب کسی بنگلے کی باڑ کے قریب سے ہو کر وہ اِس طرف آیا کرتی تھی۔ قدم بہ قدم چلتی ہوئی اُس کے قریب پہنچ جاتی۔ اور پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دوسرے موڑ سے گھوم کر غائب ہو جاتی تھی۔

پہلے چند روز بہت بے قراری میں گزرے۔ وہ حسب معمول سڑک پر کھڑا ہو کر اُس کی راہ دیکھا کرتا۔ پھر وہ سڑک کے پتھروں کو ٹھوکریں لگاتا ہوا اُس طرف روانہ ہو جاتا جدھر سے وہ آیا کرتی تھی۔ وہ کیلوں کے جھنڈ تک پہنچ کر کشمکش و پیچ میں گرفتار ہو جاتا کہ اب وہ کدھر جائے۔ مایوس ہو کر واپس لوٹ آیا۔ اور پھر اُس موڑ کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتا جہاں پہنچ کر وہ غائب ہو جاتی تھی۔

وہ کہاں سے آتی تھی، کدھر کو جاتی تھی ——— کبھی کبھی اُسے اِس موڑ پر ایک شعلہ سا لپکتا ہوا دکھائی دیتا۔ جو چند لمحوں میں غائب ہو جاتا۔

اب اُس نے سڑک پر جا کر اُس کا انتظار کرنا چھوڑ دیا۔ وہ اپنے کمرے کے اندر پلنگ پر پیٹ کے بل لیٹے لیٹے گاؤ تکیہ اپنے سینے کے نیچے رکھ لیتا اور کھوئی کھوئی نظروں سے سڑک کی طرف دیکھا کرتا۔

بیوی پاس بیٹھی باتیں کرتیں۔ بچے شور مچاتے چیختے اور چلاتے، ریڈیو ستار اور بنسری کی تانیں اُڑاتا.......... اُن کے پچھواڑے ویران جگہ میں ایک بڑے درخت کے ساتھ لٹکی ہوئی چمگادڑیں تاریکی بڑھتے ہی آسمان میں پرواز کر جاتیں۔ جب سورج نکلتا تو وہ دبک کر اپنی کمین گاہ میں چھپ جاتیں۔

۷۰

اُس کے دل میں میٹھا میٹھا درد کچھ اِس طرح بیٹھ گیا تھا جیسے پاؤں میں کانٹا چُبھ کر ٹوٹ جائے اور وہ جگہ پک جائے ۔ پیپ نکلے لیکن کانٹا جیوں کا تیوں رہے .... اور پھر کبھی کوئی دُکھ نہ دے جسم کا حصہ بن کر رہ جائے ...... کبھی کبھار جب کھٹکے تو بہت خفیف اور میٹھا سا درد محسوس ہو ۔

ڈاکو

گاؤں ایک اونچی پہاڑی پر واقع تھا۔ اُس کے بیچوں بیچ متوجو کا گھر تھا۔ وہ گاؤں کا چودھری تھا۔

نئی دُنیا کے شور وغل سے بہت دُور، پہاڑوں سے گھرا ہوا یہ چھوٹا سا گاؤں ایک جنگلی پھول کی مانند تھا، یا مکروہات دنیا سے تنگ آیا ہوا کوئی سادھو کہ تنہا اور سنسان مقام پہ پرماتما سے لَو لگائے بیٹھا تھا۔ اگر انسان کہیں دُور سے پہاڑوں کی طرف نظر دوڑا کر دیکھے تو سوائے اونچی نیچی چوٹیوں کے اور کچھ نظر نہ آئے ___ گاؤں کے سَو سوا سَو کچے مکان مہذب دنیا کو اپنی جھلک دکھانے سے بھی کتراتے تھے۔

گاؤں کے لوگ بھی اپنی دھن میں مست تھے۔ اُن کو زندگی میں کسی کمی کا احساس نہ ہوتا تھا۔ کچھ باتوں پر اُن کا ایمان تھا، کچھ باتوں کو وہ جانتے ہی نہ تھے، اور کچھ چیزوں کی اُنھیں خواہش ہی نہ تھی۔

صحت کا معیار یہ ہے کہ انسان کو اپنے اعضا کی موجودگی کا احساس

ہی نہ ہو۔ ہر عضو مرغی کے پر کی طرح ہلکا ہو۔ دکھتی ہوئی ٹانگ یا بھاری کار یا کمزور معدہ فوراً اپنی موجودگی کا احساس کروا دیتا ہے۔ عام حالات میں ہر انسان پر ایک زمانہ ایسا بھی گزرتا ہے جب اُسے اِن باتوں کا بالکل احساس نہیں ہوتا ـــــ اسی طرح نوعِ انسانی پر وہ وقت بھی آچکا ہے جب اگرچہ انسان نام نہاد ترقی کی ابتدائی منزل تک نہ پہنچا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ اُسے زندگی کے اس قدر بوجھل اور بے کیف ہونے کا احساس تک نہ تھا۔

یہ گاؤں اُسی زمانہ کی یادگار تھا۔ سیکڑوں برس پہلے جب انسان نے دفعتہً بلا منزل مقرر کئے اندھا دھند دوڑنا شروع کیا تو اس گاؤں کے بے وقوف لوگ اِس دَوڑ میں شامل نہ ہوئے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ؟

گاؤں کے لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے۔ پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر سیڑھیوں کی طرح بنی ہوئی ہری بھری کھیتیاں لہلہاتی تھیں۔ پہاڑوں کے دامن سرسبز گھاس سے اَٹے پڑے تھے۔ اِس لئے اُن کے مویشیوں کے لئے خوراک کی کمی نہ تھی۔

انسان کہیں سے کہیں پہنچ جائے اُسے دو چیزوں کی ہمیشہ ضرورت ہوگی جن کے بغیر اُن کے پرمشور کی تھکنتی بھی نہ ہو سکے گی۔ اناج اور افزائشِ نسل ـــــ گاؤں کے مردوں نے آئین سٹائین کا نام نہیں سنا تھا۔ لیکن اُنھیں کھانے کے لئے اناج مل جاتا تھا۔ اور پیٹ بھر لینے کے بعد ایسی عورتیں میسر ہوتی تھیں جن کے جسموں پر چڑھا ہوا صحت مند خوش رنگ مضبوط گوشت کیا بلحاظ بُو اور کیا بلحاظ لمس اُن لذیذ روٹیوں سے بھی لذیذ تر معلوم ہوتا تھا جنھیں کھا کر ہی اُن کے دلوں میں عورت کے

جسم کی سچی بھوک پیدا ہوتی تھی۔ یہ فلسفہ اور شاعرانہ قلابازیاں اُس انسان کو بالکل بے معنی معلوم ہونے لگتی ہیں جسے ہر قید و بند سے آزادی کے ساتھ پیٹ بھر کر روٹی میسّر آنے کے بعد وسیع آسمان تلے پھیلی ہوئی زمین کے کسی کھیت میں کوئی عورت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مل جاتی ہے۔

اب تک انسان نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ تو ظاہر ہی ہے۔ البتہ اپنے ہاتھوں اپنا یہ حق کھو دیا ہے۔ اب اُسے ڈھونڈ نکالنے پر مصر ہے ...... کیا وہ اُسے پا لے گا؟

ماکاں ـــ موتو چودھری کی بیٹی تھی۔ گاؤں کے کئی نوجوانوں کو اس سے محبت تھی۔ وہ اِن میں سے کسی کو نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی تھی۔ لیکن محبت ایک ہی سے کرتی تھی اور وہ تھا نوآب۔

نوآب اُجڈ سہی، ذرا لچّا سہی، کچھ چالاک سہی۔ لیکن وہ ان انسانوں میں سے تھا جو محبت کے سامنے قطعاً بے دست و پا ہو جاتے ہیں اور اُسے ماکاں سے محبت تھی۔

ماکاں اپنے عاشق کے ساتھ اِدھر اُدھر گھوم آیا کرتی تھی۔ اِن دونوں کی شادی میں کسی قسم کی رُکاوٹ پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ جو کچھ وہ دونوں چاہتے تھے وہ کچھ عرصہ بعد ہونے ہی والا تھا۔ اِس لئے اگر ایک طرف وہ دونوں چھپ کر ملنے کی ضرورت نہ سمجھتے تھے تو دوسری طرف اِن کے آزادانہ گھومنے پر بھی کسی کو کوئی پابندی عائد کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔

اپنے عاشق کے ساتھ کبھی وہ گاؤں سے پرے نکل جاتی، اور پھر وہ کسی ٹیلے پر بیٹھ کر نیچے پہاڑ کی وادیوں پہ نظر دوڑانے لگتی۔ جہاں

پہاڑوں سے نکل کر بل کھاتی ہوئی ندیاں اُفق کے دھند لکے میں معدوم ہوتی دکھائی دیتی تھیں ۔ اُن کے نیچے کئی چھوٹی موٹی پہاڑیاں حدِ نگاہ تک پھیلی ہوئی نظر آتی تھیں اور پھر ان پہاڑیوں کے درمیان بڑی بڑی کم و بیش ہموار وادیاں بھی تھیں ۔ درختوں کے جھنڈ چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کی طرح دکھائی دیتے تھے ـــــ حاکان کو بتایا گیا تھا کہ آگے پھیلی ہوئی زمین پر بڑے بڑے شہر ہیں .... اور پھر اُن شہروں کے عجائبات کی مبہم تصویریں اُس کے ذہن میں محفوظ تھیں ۔ شاید وہ زندگی بھر ان شہروں کی سیر نہ کر سکے لیکن اس کے لئے تو پہاڑ کے عین نیچے کچھ عمارتیں معمہ سے کم نہ تھیں ۔ ہرے بھرے درختوں کے بیچ میں یوں ہی بکھرے ہوئے پتھروں کی طرح .... کیا واقعی وہ مکانات تھے ؟ وہاں لوگ بھی رہتے تھے ؟ کیسے لوگ ؟ وہ کیسے بولتے ہیں ؟ کیا کھاتے ہیں ؟ کیا سوچتے ہیں ؟

"گریج ! وہ لوگ گریج ہیں "

اپنے عاشق کے منہ سے گریج (انگریز) کا لفظ سن کر وہ حیرت سے اُس کا منہ تکنے لگتی ۔ گریج بالکل آدمیوں کی طرح نہیں ہوتے کیا ؟

اس پر نواب ہنس پڑتا .... "اور وہاں بڑے بڑے بابو رہتے ہیں ۔ وہ بہت بڑے لوگ ہوتے ہیں ۔

"بڑے ؟ ہائے اللہ ! کتنے بڑے ؟ ..... تم سے بھی بڑے ؟"

"ہا ہا" وہ اس کی باتوں کا مکمل جواب کبھی نہیں دیتا تھا ۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ حاکان کا علم ادھورا ہی رہے تاکہ وہ تعجب کے مارے طفلانہ اداؤں کے ساتھ اُس سے ہمیشہ اِس قسم کے سوالات

دریافت کرتی رہا کرے ......" پگلی تجھے معلوم نہیں ہمارے نالے کا پانی گھوم پھر کر اُسی جگہہ تو پہنچ جاتا ہے۔ اگر تم لکڑی کا ٹکڑا پانی میں ڈال دو تو وہ بہتا ہوا اُسی جگہہ پہنچ جائے گا۔"

"سچ مچ"

یہ پانی کا نالہ دور پہاڑوں سے آتا تھا۔ فصلوں کے دنوں میں گاؤں والے وہ پانی اپنے کھیتوں کی سینچائی کے کام میں لاتے اور جب اس کی ضرورت نہ ہوتی تھی تو وہ لکڑی کا تختہ ہٹا کر پانی چھوڑ دیتے اور پانی شوریدہ سری کے ساتھ بہتا ہوا جب اُس جگہہ پہنچتا تو وہ بڑے لوگ اس سے اپنے باغوں کی کیاریوں کو سینچتے تھے۔

حاکان نے اپنے گاؤں کے لوگ دیکھے تھے یا اسی قسم کے اور اشخاص لیکن نیچے کی بستی میں رہنے والے کس قسم کے انسان تھے اُسے اس بات کا کچھ بھی اندازہ نہ تھا۔ یہ اُس کی تمنا تھی کہ وہ اس کی بابت معلومات حاصل کر سکے۔ ان کی صورت دیکھ سکے۔ ان سے باتیں کر سکے۔ اِس کے لئے اُن کے رہنے کی وادی ایک ایسا مقام تھا جہاں شاید وہ شاہزادے اور پریاں رہتی تھیں جن کے قصّے اُس نے بچپن میں اپنی دادی کی زبانی سنے تھے۔ اُس کی دادی کہانی اِس طرح شروع کرتی تھی "فلاں پہاڑ کے پیچھے کئی کوس پرے ......" یا "فلاں ٹیلے کے اوپر کئی برس پہلے ...." یا "فلاں وادی میں ...." کہیں وہ وادی یہی تو نہیں تھی ؟

"اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ وہ لوگ کرتے کیا ہیں ؟"

"ہا ہا ! کرتے کیا ہیں ؟"

حاکان کو اس کا "ہا ہا" کرکے ہنسنا بالکل پسند نہیں تھا۔ اس ہنسی کا

مطلب یہ تھا کہ وہ بے وقوف تھی ۔ اُسے کسی بات کا کچھ پتہ ہی نہ تھا۔ آخر وہ عورت ذات تھی ۔ اُس کی طرح دُور دُور کی خاک تو اُس نے چھانی ہی نہ تھی پھر اُسے ہنسنے کا کیا حق تھا۔

" ہاں تو بتا دیں !"

اب اُس کے دل میں کچھ جاننے کی ایسی شدید خواہش نہ رہتی ۔ اس لئے وہ منہ سے کچھ نہ بولتی ۔

" وہ لوگ کان سے نمک نکالتے ہیں !"

اِس بات پر حاکان کو ہنسی آجاتی ۔ آخر وہ اس قدر بے وقوف بھی تو نہ تھی " کان میں نمک ؟" یہ کہہ کر وہ اُس کا کان پکڑ کر کھینچتی " لاؤ تو ذرا تمھارے کان میں کتنا نمک ہے !"

" اری پگلی ! تو کان کا مطلب آدمی کا کان ہی سمجھتی ہے ۔ کان گدھے کا بھی ہو سکتا ہے ، ہاتھی ، بلی ، شیر ، بیل سبھی کا ہو سکتا ہے ۔ اسی طرح پہاڑوں کے کان بھی ہوتے ہیں اُن میں سے نمک نکلتا ہے ۔"

" واہ جی واہ .... جیسے میں نے تو آج تک کوئی پہاڑ دیکھا ہی نہیں ۔"

یہ بات حاکان کبھی نہ سمجھ سکی ۔ وہ یہی سمجھتی رہی کہ وہ اس کا مذاق اُڑانا چاہتا ہے ..... وادی کے وہ لوگ اُس کے لئے معمہ ہی بنے رہے ۔

" تمھیں خدا کی قسم سچ سچ بتاؤ وہ کون لوگ ہیں ۔ مجھے اُن کی بات سب کچھ بتاؤ .... جب میں چھوٹی سی تھی تو اسی چٹان پر آکر بیٹھ جاتی تھی ۔ بارش میں دُھلے ہوئے درختوں اور چٹانوں کے درمیان یہ اُجلی اُجلی کوٹھیاں کیسی بھلی معلوم ہوتی تھیں ۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کاش

میرے کندھوں پر پَر لگے ہوتے تو میں چیل کی طرح منڈلاتی ہوئی وہاں جا پہنچتی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ان مکانوں کو نزدیک سے دیکھوں۔ وہاں کے رہنے والوں سے اچھی اچھی باتیں کروں ...... ایک دُھندلا سا خیال ہے کہ اس جگہ میں نے تین مرد اور دو عورتیں دیکھی تھیں۔ اوہو وہ لوگ کیسے گورے تھے۔ اُن کی آنکھیں کتنی اچھی تھیں۔ اُنھوں نے مجھے کھانے کی کچھ چیزیں بھی دی تھیں .... کتنے اچھے تھے وہ لوگ ہائے وہ پھر کبھی نہیں آئے۔ کیوں؟ کیا وہ لوگ ادھر آنا پسند نہیں کرتے؟"

"ہوہو..... یہاں دھرا ہی کیا ہے؟ یعنی اتنی چڑھائی چڑھ کر بیچارے اس جگہ پہنچیں تو انھیں حاصل ہی کیا ہوگا؟ کیا تمھاری صورت دیکھنے آئیں گے؟"

اِس بات پر حاکان جل جاتی اور غصّہ میں اُس کا حسین چہرہ اور بھی دلکش نظر آنے لگتا۔ لیکن اگر نواب اُسے خفا کرنا چاہتا تھا تو تو اُسے پرچانے کے گُر سے بھی واقف تھا۔

"پھر تم کیوں تنگ کرتے ہو مجھے۔ اچھا کہو تو میں وہاں نہیں جا سکتی۔ کیا رستہ ایسا کٹھن ہے کہ میری یہ خواہش پوری ہونے سے رہ جائیگی۔ تم تو اول درجے کے .... ہاں بس اب خفا نہ ہونا۔ اور نہیں تو کیا کہوں۔ تم کیا جانو میرے دل کا حال .... نہیں اب تمھاری چھاتی سے نہیں لگونگی۔ تم مجھے بے وقوف بناتے ہو..... ہٹو.... اوئی!

اِس طرح وہ گھنٹوں نیم باز آنکھوں سے اِس خوابناک وادی کی طرف دیکھا کرتی۔ اُس کے نوجوان دل میں دُور کی چیزوں کو قریب سے دیکھنے کی خواہش اور انجانی چیزوں کو جاننے کی تمنا ایک قدرتی بات تھی۔

ماکاں کا باپ موجو چودھری ایک بارعب شخص تھا۔ گاؤں میں وہی سب سے بڑا مانا جاتا تھا۔ پہاڑوں کے گاؤں بھی دُور دُور ہوتے ہیں۔ لوگ ایک دوسرے سے ناواقف ہی رہتے ہیں۔ لیکن موجو کو اردگرد کی بستیوں کے لوگ خوب اچھی طرح جانتے تھے کئی موقعوں پر وہ اُس کی رائے کے طلبگار بھی ہوتے تھے۔ وہ اَن پڑھ تھا۔ اُجڈ تھا لیکن یہ خدا کی دین ہے۔ وہ سمجھدار اور دُور اندیش بھی تھا۔ اُسے نئی سے نئی ترکیبیں سوجھا کرتی تھیں۔ ہر تکلیف اور مصیبت میں وہی گاؤں والوں کا ہمدرد اور محافظ تھا۔ وہ لوگ جنگلی ہرنیوں کے گلہ کی طرح تھے اور اُن کا چودھری اس بارہ سنگھے کی مانند تھا جو کسی آنے والی مصیبت کو اپنی عقل حیوانی سے محسوس کر کے ہرنیوں کو پہلے ہی سے خبردار کر دیتا ہے۔

میلوں ٹھیلوں پر اگر جھگڑے اُٹھ کھڑے ہوتے تو موجو چودھری کے منہ سے نکلا ہوا فیصلہ اٹل سمجھا جاتا تھا۔ یہ اُس کی شخصیت اور آنکھوں کی خاص چمک ہی کا اثر تھا کہ بعض اوقات قتل ہوتے ہوتے رہ جاتے تھے۔ گھر برباد ہونے سے بچ جاتے تھے۔ یہ بھی پروردگار کا کرم ہی تو تھا کہ سبھی لوگ اُس کے سامنے سر جھکاتے تھے۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ جو کچھ کہتا یا کرتا ہے اُس سے اُنھیں کی بھلائی مقصود ہوتی ہے۔

گاؤں والوں کو کچھ آمدنی تو اپنی فصلوں کی وجہ سے ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ بھیڑیں اور بکریاں بھی پالتے تھے۔ بھیڑوں کے اُون سے وہ خاصہ روپیہ پیدا کر لیتے تھے۔ اور بکریوں کے اُون سے رسیاں

اور بورے تیار کئے جاتے ہیں ان سے بھی معقول آمدنی ہو جاتی تھی۔ اِن ذرائع سے جو بھی آمدنی ہوتی وہ ان کی گزر کے لئے بہت کافی ہوتی تھی۔ بلکہ وہ خوش حال تھے۔ کھانے پینے اور دودھ دہی کی کچھ کمی نہ تھی، گھی، دودھ، مکھن فروخت کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اِس لئے اگر کسی گھر میں گائے یا بھینس نہ بھی ہوتی تو دوسرے لوگ اُسے اِن چیزوں کی کوئی کمی محسوس نہ ہونے دیتے تھے۔ اِن سب باتوں کے باوجود چودھری مَوجو کو کوئی نہ کوئی نئی بات سوچنے کی عادت سی تھی۔

جنگ شروع ہو چکی تھی۔ چودھری کو گاؤں سے باہر شہروں کی دنیا سے بھی کچھ نہ کچھ واقفیت تھی۔ اُس نے سُنا کہ لوگ اِس زمانے میں خوب روپیہ پیدا کر رہے ہیں۔ معمولی معمولی چیزیں جنھیں جنگ سے پہلے کوئی پوچھتا تک نہ تھا اب نایاب ہو چکی ہیں۔ وہ بھی اپنے بھائی بندوں کو امیر دیکھنے کے خیالی پلاؤ پکانے لگا۔ کئی دِنوں تک وہ اِسی اُدھیڑبُن میں رہا۔ ماکاں نے باپ سے اِس سوچ بچار کا مقصد پوچھا تو اُس نے بتایا "اوہ میری بٹیا! جانتی ہے پھر کیا ہوگا؟ — تیرے لئے بہت اچھے اچھے کپڑے خرید کر لاؤں گا۔ سونے کے گہنے بنواؤں گا ایک بہت اچھا گھوڑا خریدا جائے گا...... بس پھر جو کچھ ہوگا تو دیکھ کر حیران رہ جائے گی۔"

ماکان کو اپنا باپ جادوگر معلوم ہونے لگا۔ اللہ نے اُس کے سر میں نہ معلوم اتنی عقل کہاں سے بھر دی تھی کہ اُسے کوئی نہ کوئی نئی بات ہی سوجھتی ہے۔

وہ راتوں کی خاموشی میں گھر سے باہر نکل کر کسی ڈھلوان پر جا کھڑی

ہوتی ۔ عظیم الشان پہاڑ چپ چاپ کھڑے کسی سوچ میں ڈوبے نظر آتے تھے ۔ وہ ان کی طرف دیکھتی جیسے وہ کوئی راز کہہ ڈالیں گے لیکن وہ جامد و ساکن ہی رہتے .... وہ قدم بقدم چلتی ہوئی اپنی پڑائی چٹان پر پہنچ جاتی ۔ وہاں وہ گہری سانس لیتی ۔ دماغ پر ایک نشہ سا طاری ہونے لگتا .... وہ خواب آور نظروں سے حسب عادت وادی کی طرف دیکھنے لگتی ۔ وہ عمارت جو دن میں بکھرے ہوئے پتھروں کی طرح دکھائی دیتی تھیں رات کے دھندلکے میں بالکل نظر ہی نہ آتی تھیں .... جب وہ تھک جاتی تو اُس کی نگاہیں لوٹ کر اپنے گاؤں کے دھندلے مکانوں پر منڈلانے لگتیں ۔ اِس وقت گاؤں سے کسی ڈھولک کے بجنے کی اُڑتی ہوئی صدائیں آتیں اور اُس پر ایک نئی اور ناقابل فہم کیفیت طاری ہونے لگتی ۔

اُس کا جی چاہتا تھا کہ کچھ ہو جائے ۔ بلکہ اُسے یقین تھا کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہونے والا ہے .... انسان جوانی کی عمر میں اپنے اپنے محدود دائرے کے اندر کچھ اِس قسم کی باتیں سوچا کرتا ہے ۔ یونہی منتظر رہا کرتا ہے ۔ وہ جوشیلے باپ کی جوشیلی بیٹی تھی کوئی یونہی سی امنگ اُس کے دل میں ہر آن کروٹیں لیا کرتی تھی ۔ لیکن اِس قسم کے سوچ بچار کا نتیجہ سوائے بے چینی کے اور کچھ نہ نکلتا تھا ۔

ایک روز چودھری نے گاؤں والوں کو رات کے وقت گاؤں سے باہر ایک ٹیلے پر جمع ہونے کے لئے کہا ۔ جب سب لوگ اکٹھے ہو گئے تو اُس نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے سب پر ایک سحر انگیز نگاہ ڈالی .... ماکاں بکری کا بچہ گود میں اُٹھائے عورتوں کے جھرمٹ سے

ذرا ہٹ کر چاند کی روشنی میں بیٹھی تھی۔ اُس کی ماں کو اُس کی یہ ڈیڑھ چاول کی علیحدہ کھچڑی پکانے کی عادت بہت بُری معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس وقت بچاری حاکاں بھی مجبور تھی۔ نواب نے کہہ رکھا تھا کہ "عورتوں کے جھرمٹ سے علیحدہ ہٹ کر ذرا چاندنی میں بیٹھنا تاکہ میری نظر کے سامنے رہو۔ تمھارے بغیر میرا جی نہیں لگے گا۔ اس کے دل کی خواہش کو وہ رد نہ کر سکتی تھی۔ اُس کی ماں نے ایک آدھ دفعہ آنکھوں ہی آنکھوں میں سرزنش بھی کی۔ ایک مرتبہ اس کے چھوٹے بھائی کو بھی اُسے بلانے کے لئے بھیجا۔۔۔۔۔۔ اور پھر وہ چپ ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ جانتی تھی باپ نے اپنی بیٹی کو سر چڑھا رکھا ہے۔ اس لئے لاڈلی بیٹی کو کسی کام کے لئے مجبور کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔

حاکاں اپنے غور و فکر میں ڈوبے ہوئے باپ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کبھی وہ کسی بہانے سے نواب پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال لیتی تھی۔۔۔۔ حاضرین پر خاموشی طاری تھی وہ ہمہ تن گوش تھے۔

بالآخر چودھری نے بڑے اہتمام سے کھانس کر گلا صاف کیا۔ اور اپنا چوڑا چکلا سینہ ذرا تان کر بولا "میں بہت دنوں سے یہ بات سوچ رہا تھا۔ آج مجھے ایک ترکیب سوجھی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن ترکیب بتانے سے پہلے میں تم سب لوگوں کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ آج کل لام لگ گئی ہے۔ ہر چیز کے دام چڑھ گئے ہیں اور ابھی چڑھیں گے۔ سب لوگ دونوں ہاتھوں سے روپیہ کما رہے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ اب کے جب میں شہر گیا۔۔۔۔۔۔" یہ کہہ کر اُس نے سب کی طرف رُعبدار نظروں سے دیکھا کیونکہ شہر جانے کی سعادت بس اسی کو نصیب تھی۔ سب جانتے تھے کہ جب

وہ یہ کہے کہ "جب میں سہر گیا تو اس فقرے کے بعد وہ کوئی بہت ہی
اچھے کی بات سنا دیا کرتا تھا ...... " تو ...... سہر گیا تو میں نے بڑی اچھی
کی باتیں سنیں۔ ..... کیوں سب بے جرے! تجھے نیند آ رہی ہے۔ کتنا بڑا منہ
پھاڑ رہا ہے .... یوں تو ہمیں کوئی تکلیف نہیں لیکن جندگی میں تکلیف
کبھی آن ہی پڑتی ہے۔ اس کے لیے کچھ نہ کچھ بندوبست جرور ہونا چاہئے ..؟

سب لوگ چپ چاپ بیٹھے رہے۔ تائید کرنے کی بھی در اصل کوئی
ضرورت نہ تھی۔ سب کو یقین تھا کہ چودھری نے کوئی نہ کوئی گہری بات ہی
سوچی ہوگی اور اس پر عمل کرنے سے کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہوگا نقصان نہ ہوگا
چودھری نے سلسلۂ کلام جاری رکھا " ...... بس میں کچھ ایسی ہی سوچ بچار
میں تھا .... مجھے جو ترکیب سوجھی ہے وہ بتائے دیتا ہوں کان دھر کر
سنو۔ میرا کھیال ہے کہ جن دنوں ہم کھیتی باڑی کا کام چھوڑ بیٹھتے ہیں اور
جب ہم بکریوں کے بالوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں تو ہمارا وکت
پھجول میں کھراب ہوتا ہے۔ اگر انھیں دنوں میں ہم کوئی نئی پھسل بو دیا کریں
تو کیا حرج ہے۔ تم پوچھو گے کون سی پھسل؟ میں کہوں گا السی۔
لاہ کے دنوں میں اس کی اچھی کھپت ہوگی کہ بس۔ دیکھتے دیکھتے سونے
سے ہانڈیاں بھر لوگے ...... بولو کیا کہتے ہو؟"

کوئی کیا کہتا۔ سب کو یہ بات سولہ آنے درست معلوم ہوتی تھی۔ وہ
لوگ چودھری کے ساتھ مکمل طور پر تعاون کرنے کے لئے تیار تھے۔ وہ کمسن
بچوں کی طرح چودھری کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی مداری ہو اور
اس نے واقعی مداریوں کی طرح آنکھیں گھما کر کہا "اور بھی یہ بھی بتا دوں کہ میں نے
کل ہی ایک آڑھتی سے مل کر السی پہنچانے کا اقرار بھی کر لیا ہے۔ بس تم دیکھو کیا ہے

کیا ہو جاتا ہے ...." پھر یکایک وہ بڑے انکسار کے ساتھ کہنے لگا.... بھئی مالک ہی کے ہاتھ میں ہے سب کچھ ...... کام کرنا ہمارا دھرم ہے...... کیوں بھئی پھگے ؟"

اِس کے بعد لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ انھوں نے اپنی بیویوں کو بھی یہ سب باتیں خوب اچھی طرح سمجھادیں۔ دوسرے دن سے عورتیں بھی پھولی پھولی پھرنے لگیں۔ ایک دوسری کو مبارکباد دے رہی تھیں۔ گھر گھر چودھری کا چرچا چھڑ گیا۔ چودھری حقہ ہاتھ میں اٹھائے بنئے کی دوکان کے پیچھے چبوترے پر بیٹھا بڑے بوڑھوں سے کہہ رہا تھا "مالک نے چاہا تو گاؤں کا سارا نکسہ پلٹ دوں گا...." اور پھر دفعتہً پینترا بدل کر بڑے انکسار سے کہتا "...... بھئی اُسی مالک پر بھروسہ رکھو وہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے...."

پھر سب لوگ بڑی تفصیل کے ساتھ اِس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگے۔ اب وہ زمانہ بھی قریب تھا جب وہ لوگ فصلوں کا کام ختم کرکے بکری کے اون کے بورے بنانا شروع کردیتے تھے۔ لیکن اب وہ السی بونے کی تیاریاں کرنے لگے۔ کھیتوں کو صاف کرنے کے بعد نئی فصل کے لئے اُس میں ہل چلائے گئے۔ نالے کا وہ پانی جو ان دنوں وہ چھوڑ دیا کرتے تھے انھوں نے روک رکھا تاکہ ان کے کام میں آئے۔

اِن دنوں ہماکان بھی خوش خوش گھوما کرتی تھی۔ وہ سونے کی چوڑیوں اور اپنے بھائیوں کے لئے گھوڑوں کے خواب دیکھتی تھی۔ دھوتی کا آنچل اُٹھائے کھیتوں میں پھلانگتی پھرتی تھی۔ اُس کا محبوب بھی اپنے کھیتوں

میں چھلانگتی پھرتی تھی۔ اُس کا محبوب بھی اپنے کھیتوں میں خون پسینہ ایک کر رہا تھا۔ وہ اپنی ہونے والی بیوی کے آرام و آسائش کے لئے ایک نیا مکان بنوانا چاہتا تھا۔ ایک اچھی سی گائے خریدنا چاہتا تھا۔ وہ بڑی بڑی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس کا دل نئی امنگوں اور ترنگوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا.......... اُس کے تھکے ماندے جسم پہ ہونے والی بیوی کا تصور کسی جادو اثر دوا سے کم اثر نہ کرتا تھا۔

ایک روز جبکہ خوشگوار دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ مرد ڈھلوانوں پر اپنے اپنے کھیتوں میں کھڑے ہوئے کام میں مصروف تھے۔ کسی طرف سے پسینے میں تر ایک خاکی پگڑی والا چھوٹے سے قد کا شخص ادھر آ نکلا۔ اُس نے آتے ہی لوگوں سے اِدھر اُدھر کے سوالات کرنے شروع کئے اتنے میں چودھری سینہ تانے ادھر آ نکلا۔ اُس نے بارعب آواز میں للکار کر پوچھا "کون ہو تم ؟"

نوارد نے اپنی خاکی پگڑی درست کرتے ہوئے کہا "تم کون ہو؟"

اِس پر چودھری کو بہت طیش آیا " ابے مجھے کیا پوچھتا ہے اپنی کہہ۔ تیرا مطلب کیا ہے یوں دندناتا ہوا چلا آرہا ہے۔ کیا یہ کھیت تیرے باپ کے ہیں ؟"

نوارد کچھ مرعوب ہو کر بولا " میں بڑے صاحب کا چپراسی ہوں....... نمک کی کان والے بڑے صاحب کا"

چودھری نے پگڑی جھاڑ کر سر پہ لپیٹتے ہوئے کہا " اچھا تو اب تجھے بتائے دیتے ہیں۔ میں چودھری ہوں گاؤں کا "

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد چپراسی نے اپنا مدعا بیان کیا " چودھری جی

اب کے آپ نے نالے کا پانی نہیں چھوڑا۔ صاحب لوگ حیران ہیں کہ آخر کیا بات ہو گئی؟"

چودھری نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر حقّہ گڑگڑاتے ہوئے جواب دیا:

"اردلی بھائی! اب کے ہم السی بو رہے ہیں۔ ہمیں خود پانی کی ضرورت ہے اس لئے اب کے ہم پانی نہیں چھوڑیں گے۔۔۔۔"

یہ سن کر اردلی چلا گیا اور کھیتوں میں حسبِ سابق کام ہونے لگا۔

تین چار روز امن و امان سے گزر گئے۔ لوگ اردلی کی بابت سب کچھ بھول گئے۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن ایک روز پھر وہی اردلی دو نئے آدمیوں کو ساتھ لے کر وہاں آن دھمکا۔ اُنھوں نے ہاتھوں میں لمبی لمبی لاٹھیاں تھام رکھی تھیں۔ جب کھیت میں کام کرنے والے مزدوروں کو ان کی صورتیں نظر آئیں تو وہ بیچارے عجب کشمکش میں پڑ گئے۔ وہ نہ جانتے تھے کہ ایسے موقع پر انھیں کیا کرنا چاہیئے۔ اُن کا چودھری کسی کام سے دوسرے گاؤں میں گیا ہوا تھا۔ اُس دن چپراسیوں کے تیور بھی بگڑے ہوئے نظر آتے تھے۔ آج وہ نالے کا تختہ ہٹا دینے کے لئے آئے تھے۔ گاؤں کے لوگوں نے اُنھیں سمجھا بجھا کر اِس کام سے باز رکھا۔ اور اِدھر چودھری کو بلانے کے لئے دو آدمی دوڑا دیئے۔ جب اُن آدمیوں کو گئے ہوئے کافی دیر ہو گئی تو چپراسی پھر بپھر گئے۔ اس پر دو تین نوجوانوں کو غصہ بھی آ گیا۔ لیکن بڑے بوڑھوں نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ بارے چودھری کی لحیم شحیم صورت دکھائی دی۔ اُسے دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی۔ اگر وہ چاہتے تو ان چپراسیوں کو اچھا سبق پڑھا سکتے تھے۔ لیکن چودھری کے مشورے کے بغیر وہ کچھ نہ کرنا چاہتے تھے۔

کچھ نوجوان دوڑ کر چودھری کو رستے ہی میں جا ملے اور اُنھوں نے اُسے اردلیوں کے بڑھے ہوئے حوصلوں سے بھی خبردار کر دیا۔

چودھری نے آتے ہی خشمگیں نظروں سے اُن کی طرف دیکھا "پہلے اپنی اوقات دیکھ کر بات کیا کرو۔ تم بند ہٹانے کے لئے آئے ہونا! لو، میں لٹھ لے کر اکیلا کھڑا ہو جاتا ہوں۔ تم لوگ ذرا یہ کام کر کے تو دکھاؤ۔ مجھے بھی معلوم ہو کہ تم کتنے پانی میں ہو اور تم نے اپنی ماں کا کتنا دودھ پیا ہے؟........"

اردلیوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ چودھری کی گرجدار آواز پھر گونجی "یہ نالہ ہمارا ہے۔ کسی اور کا اجارہ نہیں۔ جب ہمیں پانی کی ضرورت نہیں تھی پانی چھوڑ دیتے تھے۔ اب ہمیں خود ضرورت ہے۔ پانی نہیں چھوڑیں گے۔ جاؤ کہہ دو اپنے بڑے صاحب کو۔ اس سے جو بن پڑے کرلے۔ لیکن یہاں سے ایک بوند پانی کی نیچے نہیں جانے پائے گی........ اگر تم نے پھر ادھر کا رخ کیا اور اپنی جان سلامت لے کر واپس بھی چلے گئے تو مجھے چودھری نہیں چمار کہنا......"

وہ اردلی بکریوں کی طرح سر جھکائے آگے پیچھے پہاڑ سے نیچے اُتر گئے اور گاؤں کے لوگ اُن کے پیچھے قہقہوں کے تیر پھینکتے رہے۔

دوسرے ہی دن ایک نیا اردلی آن دھمکا کہنے لگا بڑے صاحب نے چودھری کو بلایا ہے۔

صبح کا وقت تھا۔ چودھری بھینس کا دودھ دُہہ رہا تھا۔ تو لوگوں نے اردلی کی آمد کی اطلاع دی اور مشورہ دیا کہ بڑے صاحب کے پاس نہ جائے۔ ایسا نہ ہو وہ اُس سے بُرا سلوک کرے۔ لیکن چودھری موچھ

کب ماننے والا تھا۔ وہ فوراً چپراسی کے ساتھ چل دیا۔ اُس نے اپنے ہمراہ بھی کسی کو نہیں آنے دیا —— ڈھلوان سے نیچے پہنچ کر اُس نے گاؤں والوں سے پکار کر کہا "آج میں پورا فیصلہ کر کے آؤں گا تم لوگ فکر نہ کرنا۔

لیکن گاؤں کے لوگ سارا دن فکرمند رہے اور جب شام ہونے لگی تو وہ گاؤں سے آگے بڑھ کر نیچے کی طرف دیکھنے لگے۔ اب یہ مشورہ ہونے لگا کہ دو چار آدمی چودھری کا پتہ لگانے کے لئے نیچے جائیں۔ ابھی مشورے ہو ہی رہے تھے کہ دُور سے چودھری کی شکل دکھائی دی۔ بڑے ٹھاٹھ سے جھومتا جھامتا چلا آرہا تھا۔ جب وہ قریب پہنچا تو لوگوں نے دیکھا کہ اُس کی مونچھیں تنی ہوئی ہیں۔ رنگ سرخ ہو رہا ہے اور باچھیں کھلی جاتی ہیں۔

اُس نے آتے ہی بغیر کسی سے کچھ کہے سُنے نالے کا تختہ ہٹا دیا اور رکا ہوا پانی سر پٹختا، شور مچاتا، جھاگ اُڑاتا بہہ نکلا۔

سب لوگ حیران تھے۔ چودھری نے سب کی طرف مسکرا کر دیکھا "بھئی میں بہت تھک گیا ہوں۔ ذرا دو گھڑی کھا کر حقے کے دم لگا لوں پھر تم کو سب حال سناؤں گا۔

جب رات کے وقت سب لوگ کھانے پینے سے فارغ ہو کر گاؤں کے باہر ٹیلے کے پاس اکٹھے ہوئے تو چودھری نے حقے کی نے دانتوں میں دباتے دباتے اُن کی طرف سحر انگیز نظروں سے دیکھا ...... میں دوپہر کے وقت صاحب کے پاس پہنچا ...."

حاکان ہمہ تن گوش تھی اُسے معلوم ہی نہیں ہوا کہ کب بکری کا بچہ اُس کی گود میں سے اُچھل کر پرے بھاگ گیا۔

"...... اُس وقت نوکر نے بتایا کہ صاحب آرام کر رہے ہیں..
..... اتنے میں دوسرا نوکر آیا اور کہنے لگا کہ بڑے صاحب نے کہا ہے کہ
جونہی چودھری صاحب آئیں اُنھیں بڑی تکریم کے ساتھ اندر لے آؤ..."
یہ کہہ کر چودھری نے مداری کی طرح گاؤں والوں کی طرف دیکھا "پہلے
ایک بہت بڑے کمرے میں سے گزرنا پڑا۔ قالیچے بچھے ہوئے تھے۔ میں جوتا اتارنے
لگا تو نوکر نے کہا چلے آئیے ۔۔ میں چلا گیا۔ دوسرے کمرے میں بڑے صاحب
کرسی پہ بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر بہت کھوش ہوئے اور مجھے کرسی پر بٹھایا
پھر اُنھوں نے نوکر سے کہا 'چودھری جی کے لئے چار لانا مانگتا' جب میں
چار پی رہا تھا تو میم صاحب بھی آگئیں۔ کھوب پوڈر لگائے ہوئے تھیں۔
اُنھوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا ....."
حیرت سے سب لوگوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ چودھری
اطمینان سے حقے کے کش لینے لگا۔
اُس نے آنکھوں کی پتلیاں گھماتے ہوئے کہا۔ میم صاحب
کہنے لگیں ۔۔ ول چودھری! آپ سے مل کر دل بہوٹ کھوش ہونا مانگتا۔
.... ہمارا بابا لوگ ....."
اِس طرح چودھری نے اپنے قصے کو خوب طول دے کر سنایا۔
لوگ کمسن بچوں کی طرح اُس کی باتیں سنتے رہے ......"

دوسرے دن یہ بات اِدھر اُدھر کی بستیوں میں بھی مشہور
ہو گئی۔
جب آسمان ابر آلود ہوتا تھا۔ جاکان سرد ہوا کے جھونکے

کھاتی ٹیلے پر جا کھڑی ہوتی اور وادی میں پتھروں کی طرح بکھری ہوئی اُجلی اُجلی عمارتوں کی طرف دیکھتی .... اور سوچتی نہ معلوم وہاں کون لوگ رہتے ہیں۔ وہ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ کیا کھاتے ہیں ؟ کیا پیتے ہیں ؟ .....

وہ گھنٹوں نیم باز آنکھوں سے خوابناک وادی کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔

موت

شہر کی آبادی بہت بڑھ گئی تھی۔ پرانے زمانے کا اصلی شہر تو چھوٹا سا تھا۔ لیکن نئے بازار اور جدید طرز کی عمارتوں کی وجہ سے نہ صرف شہر پھیل گیا تھا بلکہ پہلے کی بہ نسبت زیادہ خوبصورت اور بارونق بھی نظر آنے لگا تھا۔ شہر کے نواحات میں لوگ مکانات بنواتے چلے جا رہے تھے۔ بلکہ وہ نہر جو پہلے شہر سے تین میل پرے تھی۔ اب باہر بنے ہوئے بعض مکانات سے صرف چند فرلانگ پرے رہ گئی تھی۔ یہاں تک کہ شام کے وقت خواتین نہر کی سیر کرنے کے لئے چلی جایا کرتی تھیں۔ نہر کے دونوں طرف پہلے ہی کی طرح لمبے لمبے سرکنڈے اُگے ہوئے تھے۔ جہاں پہلے سانپ اور بھیڑیئے چھپے رہتے تھے۔ لیکن اب لوگوں کی آمدورفت کی وجہ سے کوئی جانور قریب نہ پھٹکتا تھا۔

خاص شہر سے اس قدر پرے تک پھیلی ہوئی یہ آبادیاں شہر کی گھما گھمی اور چہل پہل سے خالی تھیں۔ زمین کے پلاٹوں کی حد بندیاں قائم کی

جا چکی تھیں اور بعض مکان کئی کئی خالی پلاٹوں سے بھی پرے ویرانے میں اکیلے دُکیلے کھڑے تھے۔ دراصل جس پلاٹ کا سودا ہو گیا یا جو پلاٹ کسی خریدار کو پسند آ گیا اُس نے وہاں مکان بنوا لیا۔

اِس آبادی کا حُسن کچھ علیحدہ ہی تھا۔ جدید وضعوں کے بنے ہوئے نئے نئے مکانات۔ کھلی فضا۔ دھوئیں اور گرد کا نام تک نہ تھا۔ ایک بہت پر امن خاموشی طاری رہتی تھی۔ بعض مکان بن چکے تھے۔ بعض ادھورے ہی کھڑے تھے۔ بعض کی بنیادیں ہی رکھی جا رہی تھیں۔ مکانات کے ارد گرد دور تک پکی اینٹوں کے چٹے موجود تھے۔ یا کچھ اینٹیں چونا وغیرہ اِدھر اُدھر بکھرا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ کچھ راستوں پر بیل گاڑیوں کے پہیوں کے گہرے نشانات پڑ گئے تھے۔ اِرد گرد وہ پھیلے ہوئے گڑھے بھی موجود تھے جہاں سے کمہار مٹی کھود کھود کر لیجایا کرتے تھے۔ شہر کی طرف دیکھیں تو دھندلے دکھائی دینے والے کارخانوں کی چمنیوں میں دھوئیں کی بل کھاتی ہوئی لکیریں دکھائی دیتی تھیں۔

نہر کی جانب ایک شخص تنہا کھڑا تھا۔ اُس کے قریب سے کچی سڑک گزرتی تھی جو آبادی سے نہر کی طرف جاتی تھی عورتوں اور مردوں کی کوئی اکا دُکا ٹولی سیر کرتی آبادی سے نہر کی طرف یا نہر سے آبادی کی طرف جاتی دکھائی دے جاتی تھی۔ بعض منچلے کھیتوں کی طرف بھی نکل جاتے تھے۔ دور لہلہاتے ہوئے ہرے بھرے کھیتوں میں ہوا میں اُڑتے ہوئے رنگین دوپٹے بھی دکھائی دے جاتے تھے...... وہ شخص معمولی شریفانہ کپڑے پہنے کھڑا تھا۔ عمر لگ بھگ تیس برس کے ہو گی۔ وہ میانے قد اور اکہرے بدن کا معمولی شکل و صورت والا شخص

تھا۔ اُس وقت فلالین کی پتلون اور ایک پرانا گرم کوٹ پہنے تھا۔ اُس کا ہیٹ سر کی پچھلی جانب جھکا ہوا تھا۔ اس لئے اُس کی پیشانی کے اوپر بالوں کا گچھا ہوا میں ہلتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ یکے بعد دیگرے سگریٹ سلگا سلگا کر پیئے جا رہا تھا۔ وہ بالکل بے فکر نظر آتا تھا۔ اُس کی گہرے بھورے رنگ کی پتلیاں ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ جب وہ اوپر کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھتا تو اُس کی ہموار پیشانی پر ہلکے خطوط نظر آنے لگتے تھے۔

وہ عام آنے جانے والوں کی نظروں سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہوا تھا۔ کبھی کبھی وہ گھوم کر بلند قہقہہ لگانے والی کسی عورت یا مرد کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ پھر سگریٹ کے بچے کھچے ٹکڑے سے نیا سگریٹ سلگا کر اُسے چٹکی سے پرے پھینک دیتا اور وہ ٹکڑا ایک آدھ چنگاری ہوا میں چھوڑ کر سامنے والے گڑھے کے پانی میں "شڑپ" کی آواز کے ساتھ جا گرتا تھا۔

اُس نے سگریٹ کا ایک گہرا کش کھینچا اور دھواں آسمان کی طرف مرغولے بنا بنا کر چھوڑنے لگا۔ اور جب وہ اِس طرح منہ اوپر اُٹھائے ہوئے تھا اُسے دُور سے ایک عورت بچہ گاڑی ڈھکیلتی ہوئی ایک مکان کے پھاٹک سے نکلتی دکھائی دی۔ وہ ذرا سنبھل کر ٹکٹکی باندھ کر اُس طرف دیکھنے لگا۔

دور سے تو اُس عورت کی ارغوانی رنگ کی اوڑھنی ہی نمایاں طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن جب وہ قریب آئی تو اُس کی صورت بھی دکھائی دینے لگی۔ وہ کشیدہ قامت تھی نمکین لب خوبصورت

عورت تھی۔ وہ بھڑکدار ہلکے سرمئی رنگ کی شلوار پہنے تھی۔ اور
ایک اچھی قطع کا زنانہ گرم کوٹ زیب تن کیے تھے جس کی تنگ گرفت
میں چھاتیوں کا دم گھٹتا دکھائی دیتا تھا۔
اُس شخص نے عورت کو قریب آتے دیکھا تو سگریٹ کا گہرا
کش لے کر اُسے پرے پھینک دیا اور دستانے ہاتھ میں پکڑے عورت
کے آگے آگے بہت آہستہ آہستہ چہل قدمی کرتا ہوا نہر کی طرف بڑھنے
لگا ــــ وہ عورت جو شکل وصورت سے تعلیم یافتہ معلوم ہوتی تھی، بچہ
گاڑی کو ڈھکیلتی ہوئی اُس کی نسبت قدرے تیز رفتاری سے چلی
آرہی تھی۔ جب وہ اُس کے قریب سے گزری تو اُس نے اُن کی طرف
کنکھیوں سے دیکھا۔ لیکن وہ اپنی دُھن میں اپنے مسکراتے ہوئے
بچے کی طرف دیکھتی ہوئی بڑھی چلی جارہی تھی۔ جب وہ اُس کے قریب
سے گزری تو اُس نے اپنے جسم کو کچھ اس طرح حرکت دی جیسے وہ
عورت سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ لیکن جھجک کر رہ گیا۔ گاڑی میں بیٹھے
ہوئے بچے کے ہاتھ میں جھنجھنا تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں ہلا کر ہنسے جارہا تھا۔
سفید اونی سوئیٹر اور ٹوپی میں وہ برف کا گالا دکھائی دیتا۔ ابھی چار
پانچ قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ بچے نے جھنجھنا پرے پھینک دیا
یا اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ مرد نے فوراً لپک کر جھنجھنا اٹھالیا
اور بڑھ کر بچے کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور ننھے بچے کے رخسار کو چھوکر
آہستہ سے بولا "کیسا پیارا بچہ ہے"۔
عورت نے خوشنودی کا اظہار کیا جب دونوں کی نظریں
ملیں تو مرد نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا "نمستے سرلا دیوی!......"

عورت نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ مرد نے ہنستے ہوئے کہا "سرلا دیوی شاید آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ لیکن آپ غور کیجئے اپنے ذہن پر زور دے کر سوچئے آپ نے ضرور مجھے کہیں دیکھا ہے۔"

عورت کی صورت سے سوچ بچار کے آثار نظر آنے لگے۔ حسن ہر کیفیت میں نئی کشش رکھتا ہے۔ اس وقت ایسے پُرخلوص انداز سے سوچتی ہوئی وہ کیسی پیاری لگتی تھی۔ "جی" اس نے دانتوں میں نازک انگلی دبا کر کہا۔ "آپ درست فرماتے ہیں۔ میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔ اور پھر آپ میرے نام سے بھی واقف ہیں۔ نہیں کہہ سکتی آپ کو کس جگہ دیکھا ہے....... معاف کیجئے گا......

......" دیکھئے ابھی یاد آجائے گا۔"

نوجوان مرد نے قدرے تامل کیا۔ لیجئے میں بتائے دیتا ہوں۔ آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا.......... یہ آپ کا دوپٹہ زمین سے چھو رہا ہے.......... آپ کو یاد ہے جب آپ کرسچین کالج میں پڑھتی تھیں؟"

سرلا نے آنچل اٹھا کر کہا "جی جی یاد آیا..... کوئی پانچ چھ برس پہلے کی بات کر رہے ہیں آپ...."

"جی ہاں میں آپ کا ہم جماعت تھا...... شاید آپ کو یاد ہو۔ بائبل کی گھنٹی میں جب پروفیسر میسی کی میز کے قریب داہنے ہاتھ کی طرف آپ دوسری لڑکیوں کے ساتھ بیٹھا کرتی تھیں۔ میں اُن دنوں عین آپ کے سامنے بیٹھا کرتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ نے کبھی مجھے بہت غور سے نہ دیکھا ہو۔ کیونکہ آپ کی نظریں ہمیشہ جھکی جھکی رہتی تھیں..... لیکن اس کے باوجود میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کم از

میری صورت سے آشنا ضرور ہونگی ....."

"جی اب مجھے یاد آگیا.........اب میں اچھی طرح یاد کرسکتی ہوں کہ آپ کی صورت اُس وقت کیسی تھی۔ بلا ناغہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ انسان صورت سے آشنا ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا......لیکن اُس وقت آپ کے چہرے پر ڈاڑھی نہیں اُگی تھی۔ .....کیوں یہ صحیح بات ہے نا ؟"

"آپ درست فرماتی ہیں مجھے ڈاڑھی کچھ زیادہ عمر میں اُگی۔ اُس وقت میری عمر اُنیس برس کے قریب تھی۔ بیسویں برس میں ڈاڑھی اُگی۔ شاید اسی وجہ سے آپ مجھے پہچان بھی نہیں سکیں۔ اور پھر میری ان چھوٹی چھوٹی مونچھوں کی وجہ سے تو آپ اور بھی زیادہ مغالطہ میں پڑ گئی ہوں گی......"

اب وہ آہستہ آہستہ نہر کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"جی ہاں ایک تو آپ کی مونچھوں کی وجہ سے مجھے مغالطہ ہوا اور دوسری بات یہ ہے کہ اب پہلے کی بہ نسبت آپ کا بدن بھی ہلکا دکھائی دیتا ہے۔"

مرد نے قہقہہ لگایا "برعکس اس کے آپ کچھ موٹی ہوگئی ہیں۔ اس سے میری مراد یہ نہیں کہ آپ کا موٹاپا کچھ بھدا نظر آتا ہے۔ بلکہ کہنا چاہیئے کہ پہلے آپ ضرورت سے زیادہ دبلی تھیں۔ اب جسم بھر کر بس ایسا ہوگیا ہے جیسا کہ ہونا چاہیئے۔ اور چہرے پر تو مردوں کی طرح کوئی تبدیلی پیدا ہوتی ہی نہیں ہے........" یہ کہہ کر پھر اُس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اُس نے محسوس کیا یہ بات کچھ بے تکی سی منہ سے نکل گئی

اُس نے جلدی سے عورت کے چہرے پر اِس کا ردِّ عمل دیکھنے کے لئے اُچٹتی ہوئی سی نگاہ ڈالی۔ لیکن اُس کے چہرے سے بدمزگی کے کوئی آثار ہویدا نہ تھے۔ آپ ان دنوں بالکل خاموش رہتی تھیں۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو آپ اپنی ہمجولیوں سے بھی زیادہ بے تکلف نہ تھیں۔ میں نے کبھی آپ کی طرف دیکھا آپ پتھر کی مورتی کی طرح چپ چاپ اور سنجیدہ دکھائی دیتی تھیں۔ لڑکوں کے دلوں میں آپ کا بہت احترام تھا۔ دوسری لڑکیاں تو بڑے طمطراق سے اِدھر اُدھر گھوما کرتی تھیں لیکن میرے خیال میں آپ بے جا حد تک شرمیلی نہیں تھیں۔ صرف سنجیدہ نظر آتی تھیں ...... "

"آپ نے دُرست فرمایا۔ وہ دن بھی خوب تھے"

سورج غروب ہو چکا تھا۔ لیکن ابھی کافی روشنی تھی۔ اب وہ نہر کی چوڑی پٹری پر پہنچ چکے تھے وہاں کچھ اور لوگ بھی چہل قدمی کر رہے تھے۔ یہی اس آبادی کی تفریح گاہ تھی۔ چونکہ تقریباً سبھی کے گھر دُور دُور تھے اور ان میں بیشتر نووارد۔ اِس لئے اِن لوگوں کا ایک دوسرے سے میل جول کم تھا۔ چنانچہ وہ سوشل یکجہتی مفقود تھی۔ سب اپنے اپنے حال میں مست گھوما کرتے تھے۔ نزدیک ہی ایک پل تھا جہاں بہت زیادہ رونق رہا کرتی تھی۔ وہاں چار کی ایک چھوٹی سی دوکان بھی تھی۔ جہاں عورتیں اور مرد مل جل کر چار کے پیالے ہاتھوں میں لئے اِدھر اُدھر کی غپ اُڑایا کرتے تھے۔ پل کی دیوار پر بھی لوگ بیٹھے باتیں کیا کرتے تھے۔

وہ دونوں چار کی دوکان کی طرف جانے کی بجائے دوسری طرف نہر کے کنارے کنارے چل دیئے۔ پٹری کے ایک سرے پر ببول کے

درختوں کی قطار چلی گئی تھی۔ اِن درختوں کے پیچھے مویشی گھاس چرتے دکھائی دیتے تھے۔ چرواہوں نے مویشیوں کو واپس لے جانے کے لئے کھدیڑنا شروع کر دیا تھا۔

مرد نے بچہ گاڑی کا دستہ تھام کر کہا "لائیے اب یہ کام میرے سپرد کیجئے ......"

سرلا ہنس کر ایک طرف ہوگئی "لیجئے میں بھی تھک گئی تھی۔ وہ روزانہ میرے ساتھ آیا کرتے۔ لیکن جن دنوں دَورے پر چلے جاتے ہیں مجھے اکیلے آنا پڑتا ہے۔ نوکروں کا بڑا کال ہے اور پھر اُن کے مزاج بھی تو ٹھکانے نہیں۔ دو دن نوکر کو ساتھ لائی تو ماں جی سے کہنے لگا کہ ہم گاڑی ڈھکیلنے کا کام نہیں کریں گے ......"

"ارے ہشت تیری کی ...... ہنستا ہے" وہ بچے سے باتیں کرنے لگی۔ پھر مرد سے مخاطب ہو کر بولی "دیکھئے نا، میں مخلوط طریقۂ تعلیم کے سخت خلاف ہوں یعنی جس طرح کہ آج کل یہ رائج ہے لڑکوں اور لڑکیوں کو مل بیٹھنے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لڑکے اِس قدر بداخلاق نظر آتے ہیں۔ اگر کہیں لڑکی کو دیکھ پائیں تو آوازے کسنے لگتے ہیں اور لڑکیاں بچاری علیحدہ شرماتی ہیں۔ میرے خیال میں یا تو مخلوط طریقۂ تعلیم ایک سرے سے ہو ہی نہیں۔ اگر ہو تو پھر مکمل طور پر۔ تاکہ اس قسم کی قباحتیں پیدا ہونے کا اندیشہ نہ رہے ...... ہم دونوں دو برس تک اکٹھے پڑھتے رہے۔ لیکن ہم ایک دوسرے کے لئے اُس وقت بھی اجنبی تھے اور اب بھی ہیں ...."

مرد ہنس پڑا "مجھے آپ سے پورا پورا اتفاق ہے .... لیکن سرلا دیوی آپ خود بھی تو بہت شرمیلی تھیں۔ میرا مطلب ہے سنجیدہ ... کسی

لڑکے کی جرأت ہی نہیں ہو سکتی تھی کہ آپ سے گفتگو کر سکے۔ ۔"

"میری سنجیدگی کسی کی راہ میں حائل نہ ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن دراصل یہ ایک علیحدہ سوال ہے میں نے تو ایک عام بات کا ذکر کیا ہے۔"

"درست ہے یہ دو رخی کیفیت یقیناً بڑی قابلِ اعتراض ہے ...... سرلا دیوی' شاید میں آپ کے خیالات سے بہت زیادہ واقف ہوں۔ کم از کم جو کچھ آپ سمجھتی ہیں اس سے بہت زیادہ ......"

"واقعی" سرلا مسکرا دی۔ "تعجب کی بات ہے ...... افوہ زمانہ ہوا جب ہم طالب علم تھے حقیقت یہ ہے کہ مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے محض یہ خیال کہ ہم لوگ ایک ہی کمرے میں بیٹھ کر ایک ہی پروفیسر کا لکچر سنا کرتے تھے۔ ہمارے مابین ایک نہایت لطیف رشتہ پیدا کر دیتا ہے۔ آپ سے مل کر اتنی ہی خوشی ہوئی جتنی کہ کسی بچھڑی ہوئی سہیلی سے مل کر۔ یہ صحیح ہے کہ میں نے ان دنوں کبھی نظر بھر کر بھی آپ کی طرف نہ دیکھا۔ لیکن اس وقت میں ایسا محسوس کر رہی ہوں جیسے ہم دونوں گہرے دوستوں کی طرح رہے ہوں۔ شاید ان دنوں آپ مجھ سے بات چیت کرتے بھی تو نہ تو میں اس قدر مسرت کا احساس کرتی اور نہ آپ سے اتنے خلوص کے ساتھ پیش ہی آتی .... لو دس برس کے وقفے نے ان دنوں کو کس قدر حسین بنا دیا ہے۔

"اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں سگریٹ سلگا لوں .... شکریہ ..... اب میں اپنی ایک شرارت کا ذکر کروں گا۔ ایک روز آپ کالج لائبریری کے اندر کوئی کتاب نکلوانے کے لئے گئیں۔ آپ اپنی ایک بڑی سی نوٹ بک بھول گئیں۔ آپ کی غیر حاضری میں میں نے اٹھا کر اس کی ورق گردانی شروع

کر دی۔ اس میں آپ نے بڑے بڑے لوگوں کے اقوال جمع کر رکھے تھے۔
میں انھیں پڑھ کر بہت محظوظ ہوا۔"

سرلا کچھ محجوب سی ہو گئی "جی ہاں اُس وقت شباب کا آغاز ہوتا ہے
نوجوان کئی نصب العین سامنے رکھتے ہیں۔ بڑے بڑے مفکروں کے اقوال پر سر
دھنتے ہیں۔ لیکن آخر کار وہ گھر کے دھندوں میں پھنس کر رہ جاتے ہیں.....
.... آخر آپ کے کیا مشاغل رہے۔ آپ کہاں کہاں گھومے۔ کیا کیا واقعات
پیش آئے......کوئی مزیدار بات سنائیے"

یہ سُن کر مرد کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ اُس نے سگریٹ کا کش لگایا اور چپ چاپ
زمین کی طرف دیکھتا ہوا بھاری قدموں سے چلتا گیا۔ سرلا اُس کے چہرے
پر اس قسم کے جذبات دیکھ کر متعجب ہوئی۔

"سرلا دیوی! آپ یہ کیا بات پوچھ بیٹھیں"

سرلا نے حیرت سے کہا "آخر کیا بات ہے؟ آپ کا چہرہ اس قدر
پھیکا کیوں پڑ گیا؟ کیا کوئی خاص حادثہ پیش آیا ہے؟"

مرد نے ہلکی سی آہ بھر کر کہا "سرلا دیوی! یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ
کو ہر طرح سے مطمئن دیکھ کر مجھے کس قدر خوشی حاصل ہوئی...... شکر ہے کہ
میں بدنصیب ہی اس مصیبت میں گرفتار ہوا.......... میں ...... دراصل
سرلا دیوی! میں نے ایک قتل کر دیا تھا...؟"

"قتل"

"جی ہاں.....میں نے وہ قتل کیوں کیا؟ ......سرلا دیوی! مجھے
خواب میں خیال نہیں تھا کہ میں کبھی کسی کو قتل کر ڈالوں گا......"

عورت کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مرد نے سگریٹ

پرے پھینک دیا اور کہا " یہ قتل میری بہن کی وجہ سے ہوا۔ میرا بہنوئی بہت ہی بدمعاش شخص تھا۔ اخلاقی لحاظ سے حد سے گرا ہوا، سرلا دیوی! آپ اس بات کا اندازہ لگا ہی نہیں سکتیں کہ وہ کس قدر ذلیل انسان تھا۔ خیر وہ خود تو من مانی کارروائی کرتا ہی تھا لیکن اس کے ساتھ ہی میری بہن کی زندگی عذاب میں ڈال رکھی تھی تنگ آ کر بہن نے ایک مرتبہ مجھے چٹھی لکھی۔ میں اُن کے گھر میں پہنچا۔ بہن نے کل حالات بتلائے۔ اتنے میں وہ خود آن پہنچا۔ آتے ہی بہن کو گندی گندی گالیاں دینے لگا۔ وہ اُس وقت کچھ نشہ میں بھی تھا۔ نہ اُس نے میرا خیر مقدم کیا نہ کچھ لحاظ بہن نے میرا واسطہ دے کر اُسے منہ بند کرنے کے لئے کہا تو وہ مجھ پر پل پڑا۔ مجھے از حد غصہ آ رہا تھا ٹوٹی ہوئی چارپائی کا ایک پایہ میرے ہاتھ میں آ گیا میں نے ایک بھرپور ہاتھ جو دیا تو بھیجا باہر نکل پڑا۔ میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اُسے فوراً ہسپتال لے گئے لیکن وہ وہاں پہنچتے پہنچتے مر گیا۔۔ سرلا دیوی! اب آپ سے کیا چھپانا۔ یہ ہمارا گھریلو معاملہ تھا ...... میں گرفتار ہو گیا "

عورت مارے تعجب کے اُسی جگہ جم کر کھڑی ہو گئی۔ " پھر؟ "

" پھر مجھے پھانسی کی سزا ہو گئی "

عورت کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اُس نے بچہ گاڑی کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ " پھر آپ بھاگ آئے جیل سے؟ "

مرد نے کھوکھلی نظروں سے عورت کی طرف دیکھا " جی نہیں کل مجھے پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا جائے گا "

قدرے تامل کے بعد وہ پھر کہنے لگا " آپ کو تعجب ہو رہا ہے؟ جی ہاں، آپ کیا میں خود تعجب میں ہوں۔ میں خود اس بات پہ یقین نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے .... شاید آپ کو یاد ہو۔ ہمارے ساتھ ایک لڑکا

شیو شنکر پڑھا کرتا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔جی ہاں وہی جو بائبل کے گھنٹے میں سب سے زیادہ اعتراضات کیا کرتا تھا ــــ وہ آج کل جیلر انچارج ہے۔ وہ میرا جگری دوست تھا۔ میں نے اُس کی منت کی کہ وہ مجھے چند گھنٹوں کے لئے آزاد کر دے۔۔۔۔۔۔ اسی کے طفیل میں اب اس کھلی ہوا، لہلہاتے ہوئے کھیتوں، ہنستے کھیلتے لوگوں اور ان خاموش درختوں کو الوداع کہنے آیا ہوں۔۔۔۔۔۔"

اس کے بعد سکوت طاری ہو گیا۔ عورت اپنے خیالات میں گم ہو گئی اُس نے ایک آدھ مرتبہ اُچٹتی نظروں سے مرد کی طرف دیکھا۔ جس کا چہرہ لاش کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ اُس کے بے جان سے بازو آہستہ آہستہ حرکت کر رہے تھے۔ اُس نے کپڑے بھی بے پروائی سے پہن رکھے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔اس طرح بالکل چپ چاپ وہ دس پندرہ منٹ تک چلے گئے۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ اب پورا چاند آسمان پر جلوہ افروز ہو رہا تھا۔ اُس کی صاف ستھری چاندنی بھی اُداس اُداس دکھائی دیتی تھی۔ نہر کا پانی بھی ایسا معلوم ہوتا جیسے چوروں کی طرح دبے پاؤں چلا جا رہا ہو۔

معاً عورت کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ مرد نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا ببول کا کانٹا اُس کے سینڈل کی کھلی جگہ سے اُس کی ایڑی میں جا چبھا تھا۔ اُس نے بچہ گاڑی کو چھوڑ کر اُسے سہارا دیا۔ "آپ اِدھر بیٹھ جائیے اونچی جگہ پر۔۔۔۔۔۔ ذرا صبر کیجیے۔"

عورت بیٹھ گئی۔ مرد نے اُس کا پاؤں اپنے زانو پر رکھ لیا۔ "کانٹا ٹوٹ گیا ہے۔ یہ کہہ کر وہ اپنے کوٹ کا کالر ٹٹولنے لگا۔ ایک پن نکال کر اُس نے عورت کا سینڈل اُتار دیا اور کانٹے والے مقام کو چٹکی میں دبا کر اُس نے

اُس جگہ کو پن سے کریدنا شروع کر دیا۔ عورت نے ہونٹ دانتوں تلے دبا کر اپنی پنڈلی دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ لی ۔۔۔ درد کے مارے اُس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ مرد کی طرف دیکھتی رہی جو بڑے انہماک سے کانٹا نکالنے میں مشغول تھا۔ اُس کے ہاتھوں کی انگلیاں بڑی احتیاط سے حرکت کر رہی تھیں۔ اُس کی متجسس آنکھیں ایڑی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس وقت وہ صورت سے کس قدر بے لوث اور سیدھا سادا شخص دکھائی دیتا تھا۔ اُس کے سر کے بال بچوں کے بالوں کی طرح باریک اور ملائم نظر آتے تھے۔ وہ ازحد احتیاط سے کانٹے کے اردگرد کا گوشت ہٹا رہا تھا۔ پھر اُس نے پن ایک طرف رکھ کر کانٹے کو چٹکی میں پکڑا اور باہر کھینچ لیا۔ عورت کو درد کا ایک جھٹکا سا لگا اور پھر اُسے بے حد راحت کا احساس ہوا۔ مرد نے کانٹا ہتھیلی پر رکھ کر دکھایا۔ اُس وقت اُس کے اُداس چہرے پر بچوں کی سی بھولی ہنسی کس قدر بھلی دکھائی دیتی تھی۔

عورت نے ایڑی کو گھما کر دیکھا۔ خون کی ایک بوند جھلک رہی تھی مرد نے کہا "ذرا ٹھہریئے" یہ کہہ کر اُس نے جیب میں سے رومال نکالا اور وہ بوند پونچھ ڈالی۔ اور پھر رومال کی تہ بنا کر اُسے اُسی مقام پر باندھ دیا سرد ہوا کے جھونکے پانی کو چھو کر آتے اور اُن کے بالوں سے اٹکھیلیاں کرتے ہوئے آگے نکل جاتے۔ وہ تھوڑی دیر تک اُسی جگہ بیٹھے رہے۔ ہر طرف سکون اور خاموشی طاری تھی۔ دُور چار کی دوکان

[illegible] روشنی میں چ [illegible]

دمک رہے تھے۔ بچہ ہمک ہمک کر چاند کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے گردن پھیرتا

تو اُس کا سر جھک جاتا اور وہ پھر اپنے سر کو اُٹھاتا اور چاند پر نگاہیں جما دیتا۔

اس اُداسی میں بھی بچے کی اس حرکت پر ان دونوں کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ کھیلنے لگی ...... یکایک مرد نے عورت کی طرف دیکھا "سرلا دیوی! ....."

"جی!"

"مجھے آپ سے ایک بات کہنی ہے۔ اب میں کہے بغیر نہیں رہ سکتا ...."

عورت نے کچھ متعجب ہو کر اُس کی طرف دیکھا۔

مرد نے قدرے تامل کیا پھر بولا "میری جرأت کا بُرا نہ مانیئے گا .... میں آپ سے محبت کرتا ہوں .... میں شرمسار ہوں .... لیکن میں آپ کی پوجا کرتا ہوں۔ طالب علمی کے اس زمانے سے میں .... آپ ہی کی پرستش کرتا ہوں .... مجھے معاف کیجئے .... میں اپنے اس اوچھے پن کے لئے شرمسار ہوں ...... کیا آپ خفا ہو گئیں؟"

عورت کے دونوں ہاتھ سینے پر جا لگے۔ تعجب کے مارے اُس کا منہ تھوڑا سا کھل گیا اور اُس کے سپید دانت ہونٹوں میں سے اپنی جھلک دکھانے لگے۔

"سرلا دیوی! میں نے بہت دنوں تک یہ آگ اپنے سینے میں دبائے رکھی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنے آپ کو آپ کی محبت کے قابل نہیں سمجھتا۔ اور اب جبکہ آپ شادی شدہ عورت

ہیں۔ میرا یہ کہنا بالکل زیب نہیں دیتا۔ میں کبھی یہ الفاظ اپنے منہ سے نہ نکالتا۔ لیکن آج جبکہ میری زندگی کا آخری دن بھی ختم ہو چکا ہے میں صرف اتنی سی بات کا اعتراف کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں.......... اور فرمائیے میں لاچار تھا......... آپ سے میں نے جان بوجھ کر محبت نہیں کی.......... میری داستان صرف اتنی ہی ہے کہ آپ نے جب پہلی مرتبہ میری طرف دیکھا تھا۔ میں اپنا دل کھو بیٹھا۔ میں مجبور تھا۔ مجھے اپنی شکست کا اعتراف ہے...... میں آپ سے یہ بات کبھی بھی نہ کہہ سکا.......... میں اس قابل ہی کہاں تھا۔ مجھے یہی احساس تھا کہ میں آپ کے قابل نہیں کس منہ سے آپ کی محبت کا دم بھروں — بزدل کہئے۔ مجھے انکار نہیں۔ کمینہ کہئے میں برا نہیں مانوں گا...... انسان کی فکر خواہ کتنی بھی بلند کیوں نہ ہو جائے........ اور اس کے کارنامے خواہ کچھ بھی کر دکھائیں حقیقت یہ ہے کہ وہ پھر بھی بعض مقامات پر ہمیشہ کمزور رہے گا...... بیسیوں لڑکیاں آئیں اور گزر گئیں۔ انھوں نے کبھی میرے دل پر اس قسم کا اثر نہیں ڈالا۔ وہ آپ سے زیادہ خوبصورت بھی تھیں۔ زیادہ چنچل اور شاید زیادہ خوش گفتار بھی۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ مجھے آپ کی کون سی ادا بھا گئی۔ میں نہیں جانتا کہ آخر مجھے ہوا کیا۔ مجھے آپ یا کوئی شخص کچھ بھی کہے لیکن میرے لئے آپ ہی سب کچھ تھیں۔ کالج میں آپ کا یہ پرستار خاموشی سے آپ کی پوجا کرتا رہا........ آپ نے تعلیم کا سلسلہ بند کر دیا۔ میں دور ہی دور سے آپ کی زیارت کرتا رہا.......... آپ کی شادی ہو گئی میں نے اُف

نہیں کی .... آپ خوش ہیں۔ یہی امر میرے لئے باعث تسکین تھا .... مجھ میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ میں اپنا سینہ کھول کر آپ کے سامنے رکھ دوں ...... آپ مجھے خواہ کچھ بھی کہئے بس اتنی سی بات سمجھ لیجئے کہ میں آپ کا بندہ تھا۔ آپ کا زر خرید غلام تھا۔ میں آپ کا اپنا ہی تھا .... سالہا سال سے یہ روگ میری جان کو گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا .... آج کے روز میں اس بات کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا .... آپ نے انجانے طور پر ابرو کے ایک اشارے سے مجھے کہیں کا نہ رکھا .... شاید جان بوجھ کر آپ ایک حقیر چیونٹی کو نہ مار سکیں .... لیکن ایک آتما اتنے دنوں تک آپ ہی کی خاطر اس قدر دکھی رہی ...... کیا آپ کا حساس دل اسے پورے طور پر محسوس کئے بغیر رہ سکتا ہے۔ کیا آپ مجھ مہجور کے دل کی جلن کا اندازہ لگا سکتی ہیں .... کیا آپ اس سالہا سال کے کرب اور بے چینی کا تصور کر سکتی ہیں .... آپ بُرا نہ مانئے گا .... میں جذبات کی رَو میں نہ معلوم کیا کیا بک گیا ...."

اچانک یہ معلوم اور محسوس کر کے کہ کسی شخص کی اُس کی محبت میں کیا سے کیا حالت ہوئی عورت کے چہرے پر ایک عجیب کیفیت پیدا ہو گئی وہ بت کی طرح خاموش اور جامد بیٹھی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا کہے۔ مرد کی آواز شدتِ جذبات سے تھرتھرائی ہوئی تھی اور اُس کے الفاظ میں کوہِ آتش فشاں کے دہانے سے نکلتی ہوئی آگ کے شعلوں کی سی گرمی اور تندی تھی ـــــ عورت کی آنکھیں جھک گئی تھیں۔ وہ ایک لفظ تک نہ کہہ سکی۔ وہ اُس سے نظر تک

نہ ملا سکی ــــ کچھ دیر سکوت طاری رہا ــــ پھر عورت نے چھپی نظروں سے اُس مرد کی طرف دیکھا جس نے اُس سے اِس قدر شدت سے اور اتنی خاموش محبت کی تھی ــــ مرد کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ بھی زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس عورت کے روبرو کسی مرد نے آج تک اِس طرح محبت کا اظہار نہ کیا تھا اور یہ سب کچھ آنکھ جھپکتے میں ہو گیا۔ وہ سنبھل ہی نہ پائی آخر اب وہ کیا کرے......؟

مرد نے تنکا توڑتے ہوئے کہا "سرلا دیوی! اپنے اس پگلے کو معاف کر دیجئے۔ چند گھنٹوں کی بات اور ہے۔ مرنے والے کی باتوں کا غصہ نہ کیجئے گا۔ میں جانتا تھا مجھے یہ سب کچھ ہرگز نہ کہنا چاہئے تھا.......
.....لیکن سرلا دیوی! چند گھنٹے پہلے جب شیو شنکر نے مجھ سے کہا دوست! جاؤ چند گھنٹے دنیا کی سیر کر آؤ۔ مجھے تم پر اعتماد ہے..... مجھے یقین ہے کہ تم ہماری دوستی کی پاکیزگی کی توہین نہیں ہونے دو گے......میں چند گھنٹوں کے لئے تمہاری غیر حاضری کا راز پوشیدہ رکھ سکتا ہوں "........ میں جب باہر آیا تو وسیع دنیا میرے سامنے تھی۔ ایک بہن تھی یہاں سے بہت دور۔ میں وہاں تک پہنچ نہ سکتا تھا۔ باقی اس دنیا میں میرا کون تھا۔ میں نے سوچا بہت سوچا..... اور پھر سرلا دیوی مجھے آپ کا خیال آیا۔ یہ درست ہے کہ آپ نے آج تک کبھی میری بابت سوچا تک نہ ہوگا۔ لیکن میری زندگی کا ہر لمحہ آپ کی یاد میں گزرا تھا۔ آپ کے لئے میں بیگانہ تھا۔ لیکن میرے لئے آپ بیگانہ نہیں تھیں۔ میں نے آپ کی تصویر کو ہمیشہ اپنے دل کے اس قدر قریب رکھا تھا کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے آپ میری ہی ہیں جس کی

یاد میں میں نے زندگی کی ایک ایک گھڑی گزار دی۔ کیا اب پر میرا اتنا بھی حق نہ تھا؟۔۔۔۔۔۔ شاید زندگی کے آخری لمحوں نے مجھے اس قدر جذباتی بنا دیا ہے۔ شاید دوسرے مرد اس طرح محبت نہ کرتے ہوں۔ وہ میرا مذاق اڑائیں۔ لیکن سرلا دیوی! میں تو آپ کا بندہ۔ اب خواہ اپنے اس غلام کو سزا دیجئے یا اس کی جان بخشی کر دیجئے۔ میری گستاخی معاف فرمائیے۔۔۔۔۔۔ شاید آپ دریافت فرمائیں کہ آخر اب اس محبت کو جتانے کا مقصد کیا تھا؟ ۔۔۔ سو جواب میں عرض ہے کہ کچھ مقصد نہیں۔ کوئی غرض نہیں۔ یونہی دل نے چاہا کہ مرنے سے پہلے محبوبہ کے کانوں تک اپنی محبت کا پیغام پہنچا دے۔ موت کے اس قدر قریب پہنچ کر میں ضبط نہ کر سکا۔ میں محض اعتراف کرنے کے لئے چلا آیا۔ بس۔۔۔۔۔۔۔۔ اب میں ادب کے ساتھ آپ سے درخواست کروں گا کہ اگر میرے الفاظ سے آپ کے دل کو صدمہ پہنچا ہو تو باور فرمایئے اس کے لئے تہِ دل سے شرمسار ہوں بلکہ مجھے خود اس امر کا دکھ ہے۔۔۔۔۔۔"

عورت بے خیالی میں گھاس پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ اُس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اُس کا سینہ سانس کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ نیچے اوپر ہو رہا تھا۔۔۔۔۔۔ مرد بھی خاموشی سے دوسری طرف تکتا رہا۔ وہ خود عورت سے نظریں ملانے سے کتراتا تھا۔

خاموشی لمحے گزرتے گئے۔۔۔۔۔۔ بالآخر مرد نے کہا آیئے اب واپس چلیں۔ عورت چپ چاپ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

بچہ گاڑی کے پہیوں میں سے چوں چوں کی آواز سنائی دے رہی

تھی۔ بچہ سوگیا تھا۔ اس ویرانے کی ہر شے پر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔
وہ چلتے چلتے چار کی دوکان تک پہنچے۔ وہاں مرد سگریٹ لینے کے لئے گیا۔ عورت اُسے پیچھے سے دیکھتی رہی۔ جب وہ واپس آیا تو وہ سر جھکائے اُس کے ساتھ ہولی۔ نہر کی پٹری سے اُتر کر تھوڑی دُور پہنچے تو مرد رُک گیا۔ اُس نے سگریٹ کا گُل جھاڑتے ہوئے کہا "اچھا سرلا دیوی! اب مجھے اجازت دیجئے۔ نہ معلوم آپ دل میں میری بابت کیا خیال کرتی ہوں گی.......... کم از کم مجھے اتنا تو بتا دیجئے کہ آپ مجھ سے خفا تو نہیں ہیں؟

عورت نے پاؤں سے زمین کریدنے کی کوشش کرتے ہوئے آہستہ سے کہا...... "جی نہیں......"

"بہتر......" مرد نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "نمستے"

عورت نے کچھ جواب نہ دیا۔ اُس نے رُخ پھیر لیا اور پھر آہستہ آہستہ چلدی.......... مرد قدرے سکوت کے بعد کھیتوں کی طرف چل کھڑا ہوا...... کچھ دُور جا کر اُس نے مڑ کر دیکھا کہ عورت چپ چاپ کھڑی اُس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ وہ بھی رُک گیا اُسے ایسے معلوم ہوا جیسے وہ بلا رہی ہو.......... وہ کچھ دیر رُکا رہا کہ شاید وہ چلدے۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ وہ پھر واپس اُس کے پاس پہنچا۔ "آپ.... گھر جائیے نا، رات ہو گئی ہے....."

وہ چپ رہی۔

"آپ جاتی کیوں نہیں؟"

عورت نے دھیمی آواز میں پوچھا "آپ کو واپس کس وقت پہنچنا ہے؟

"صبح چار بجے سے پہلے پہلے"
عورت نے اُچٹتی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا..." آپ آج ہمارے ہاں آجائیے نا...... سب لوگ سو جائیں تو...... ہم باتیں کریں گے"
یہ کہتے کہتے اُس کے رخسار سرخ ہو گئے۔

——وہ چل دی۔
مرد کچھ دیر تک اُسے دیکھتا رہا۔ جب وہ کافی دور نکل گئی تو اُس نے ایک نیا سگریٹ مُنہ میں دبا لیا۔ اُس کے لبوں پر ایک شریر مسکراہٹ پیدا ہوئی... اور اُس کی بھوری آنکھیں شرارت سے چمک اُٹھیں۔

عورت بڑی کھڑکی کے قریب بیٹھی دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اپنے عاشق کا انتظار کرتی رہی۔ دُور سے ہر پرچھائیں پر اُسے اس کا شبہ ہوتا تھا—لیکن وہ نہ آیا اور نہ پھر کبھی اُس کی صورت ہی دکھائی دی۔

اجنبی

برآمدے کے جس حصے میں وہ بیٹھا تھا وہ حصہ اُس کے بنگلے کے بالکل ایک کنارے پر تھا۔

رات کا وقت تھا، بارش ہو جانے کی وجہ سے آسمان دُھل دُھلا کر صاف ہو گیا تھا۔ اور ستارے چھوٹے بڑے بتاشوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ درختوں کی ٹہنیاں اور پتیاں بوجھل ہو کر جھکی ہوئی اِس طرح دکھائی دیتی تھیں جیسے وہ کچھ سوچ رہی ہوں۔ بارش ہو جانے کے بعد اگرچہ سردی پہلے سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ لیکن اِس کے باوجود موسم بہت خوشگوار تھا۔ ایسے اچھے موسم میں چاہیے تو یہ تھا [illegible] تھی۔ بلکہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہر چیز مسرت و شادمانی کی منزلوں سے گزر کر مکمل اطمینان اور آسودگی میں ڈھلی ہوئی تھی۔ جیسے ہر پیڑ، ہر پودے، ہر مکان، ہر اینٹ، ہر پتھر، گھاس کی ہر پتی غرض ہر شے پر غنودگی سی

طاری ہے۔ جیسے وہ سب ہلکے نشے میں مبتلا ہوں۔ یا جیسے ابھی ہر چیز جاگ اُٹھے گی اور ایک ہی تال پر وہ سب مل جل کر کوئی اچھوتا گیت اور کوئی نیا رقص شروع کر دیں گے۔

بیرونی دنیا پر اگر اس قدر سکون طاری تھا تو اُس کے دماغ میں نیا طوفان اُمڈ رہا تھا۔

اس وقت اُس کی عمر ساٹھ برس کے قریب تھی۔ اگرچہ وہ اپنی عمر کے لحاظ سے صحت ور تھا۔ لیکن بڑھاپا پھر بڑھاپا ہے۔ وہ پہلے کی سی امنگ اور ترنگ اب کہاں۔ اس وقت وہ ایک آرام کرسی پر بیٹھا خلا میں گھور رہا تھا۔

یہ بنگلہ اسی کا بنوایا ہوا تھا۔ وہ سالہا سال سے اپنے مخصوص کمرے کے سامنے اسی برآمدے میں اسی طرح بیٹھے رہنے کا عادی تھا۔ سامنے دُھندلکے میں ٹینس کورٹ پر کھنچی ہوئی چونے کی پھیکی، ٹوٹی پھوٹی اور ادھوری لکیریں نظر آ رہی تھیں۔ ٹینس کورٹ کے اس طرف لوہے کی ایک بینچ پڑی تھی۔ جب اُس نے یہ بنگلہ بنوایا تھا اُسی وقت یہ بینچ بھی اِس جگہ رکھوا گئی تھی۔ اُس وقت سے اب تک بارش دھوپ اور اوس میں یہ بینچ پڑی رہی لیکن اس کا کچھ نہ بگڑا تھا۔ کس قدر مضبوط تھا یہ لوہا........ بیٹھے بیٹھے وہ فلسفیوں کی طرح اس بینچ پر غور کرنے لگا ایک بڑی سی پھیلی ہوئی گود کی طرح یہ بینچ بالکل کوئی جاندار شے معلوم ہوتی تھی۔

زندگی میں کتنی مرتبہ وہ اس بینچ پر بیٹھا تھا۔ لیٹا تھا، اُس کا سہارا لے کر کھڑا ہوا تھا۔ اُس کی بیوی اور اُس کے بچے بھی اُس پر بیٹھے رہے

وہ بچے جو کبھی بڑی مشکل سے اُس پر چڑھ پاتے تھے۔ اب کھڑے کھڑے اُسے پھلانگ سکتے تھے۔ ہر شے بدل گئی۔ اُس کے بچے جوان ہو گئے وہ جوان سے بوڑھا ہو گیا لیکن اُس بینچ کا کچھ نہ بگڑا تھا۔ وہ کھلائی بھی جو گھر میں بچوں کے لئے مقرر کی گئی تھی اب بوڑھی ہو چکی تھی۔ حالانکہ جب وہ آئی تھی تو نہ صرف اُس کی صورت اچھی خاصی تھی بلکہ جوان بھی تھی۔ ان دنوں اُس کی پہلی بچی پیدا ہوئی تھی۔ وہ بھی جوان تھا اُس کی بیوی بھی جوان تھی۔ اس لئے اُس کی بیوی اُس عورت کو گھر میں ملازم رکھنے سے کچھ ہچکچائی بھی تھی۔ اُسے یہ بات اچھی طرح یاد تھی کہ اپنی بیوی کو چڑانے کے لئے وہ یونہی نئی ملازمہ کی تعریف کر دیا کرتا تھا۔ یا کوئی بھی مشکوک حرکت کر دیا کرتا تو اُس کی بیوی دل ہی دل میں جلا کرتی تھی۔ اب وہ کھلائی بھی بوڑھی ہو گئی تھی۔ بلکہ اب تو خیر سے وہ چشمہ بھی لگاتی تھی جس کے دونوں سروں پر دو موٹے موٹے سیاہ رنگ کے تاگے بندھے ہوئے تھے۔ اب اُس کی بیوی کو کوئی فکر نہ تھی........ اِدھر یہ بینچ اسی طرح کھڑی تھی۔ اسے بھی وہ کسی خدمت کے لئے خرید کر لایا تھا۔ اُس نے خدمت گزاری بھی کی اور پھر ویسی کی ویسی ہی تھی۔

بعض اوقات اگر انسان ان باتوں پر غور کرے تو ایسی بے جان چیزیں جو بدستور اپنی اصلی حالت پر قائم رہتی ہیں انسان کے لئے بہت ہی اذیت دہ ثابت ہوتی ہیں۔ عمارتیں، سڑکیں، پہاڑ، دریا وغیرہ ایک انسان کی زندگی کے دوران میں عموماً روزِ اول ہی کی طرح قائم اور سلامت رہتے ہیں۔ انسان بدلتا رہتا ہے لیکن اس کے اردگرد کی

چیزوں میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بات اِس طرح بڑی اذیت رساں محسوس ہونے لگتی ہے کہ پہلے جس پہاڑ پر انسان ہنستا کھیلتا، چٹکیاں بجاتا چڑھ جاتا تھا۔ اب اس حصے کسی صورت میں بھی اس پر نہیں چڑھا جاتا۔ اس طرح کچھ اس قسم کا احساس ہونے لگتا ہے جیسے اُسے بھری محفل سے بے آبرو کر کے دھکے دے دے کر نکالا جا رہا ہو۔

وہ دریا جو پہلے آغوش پھیلائے ہنس ہنس کر اُس پار تک تیرنے کی دعوت دیتا تھا۔ اب اُس کے سامنے علانیہ حقارت سے ہنس کر آگے بڑھ جاتا ہے اور بوڑھا انسان چپ چاپ کھڑا رہ جاتا ہے۔

وہ بڑے سے بڑا درخت جس پر وہ اُچک کر بندر کی طرح چڑھ جاتا اور چشم زدن میں اُس کی بلند ترین ٹہنیوں پر پہنچ جاتا تھا اب اُس بوڑھے کھوسٹ کو بڑی رعونت سے دیکھتا ہے اور ایسی بے رُخی سے پیش آتا ہے جیسے کبھی اُسے دیکھا ہی نہ ہو۔

وہ بھرپور چھاتیوں والی عورتیں جن کی طرف دیکھ کر جب وہ آنکھ مارا کرتا تھا اور وہ جواب میں دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ نظریں جھکا لیتی تھیں اب "ہٹ رے بابا! رستہ چھوڑ" کہہ کر ایک زنانے کے ساتھ قریب سے گزر جاتی ہیں اور انسان کا دل کٹ کر رہ جاتا ہے۔ لیکن اس پر کسی کا کیا زور تھا۔ ایک نامعلوم بہاؤ تھا کہ انسان اس میں بہتا چلا جا رہا تھا۔ یہاں ڈوبتے کو روایتی تنکے کا سہارا نہ ملتا تھا۔

بڑھاپا بجائے خود ایک مرض تو خیر ہے ہی۔ لیکن اگر اس کے ساتھ ہر جاندار اور بے جان چیز کی بے رُخی بھی شامل ہو جائے تو زندگی کس قدر تلخ ہو جاتی ہے۔ اِس عمر میں ہر شے یہی کہتی دکھائی دیتی ہے:۔

"ہٹ رے بابا! رستہ چھوڑ" ہر چہار طرف سے اِسی قسم کی آوازیں آنے لگتی ہیں اور ہمارا نحیف و نزار بوڑھا لڑکھڑاتا ہوا حیرانی سے اُن لوگوں کی طرف دیکھتا ہے جو بڑے جوش و خروش کے ساتھ بڑھے جاتے ہیں۔ انھیں اس قدر جلدی کس بات کی ہوتی ہے۔ وہ کہاں پہنچ جانا چاہتے ہیں ــــ آخر میں تو یہی ہوگا کہ اُن کا وہ دن بھی آ پہنچے گا جبکہ دنیا کی کوئی شئے اُن کی رفاقت کا دم نہ بھرے گی۔ انھیں بھی سب رستہ چھوڑنے کے لئے کہیں گے۔

تو کیا خود اس نے اِن باتوں پر پہلے بھی کبھی غور کیا تھا؟

اُس کے کانوں کو سردی محسوس ہونے لگی اُس نے مفلر کانوں پر لپیٹ لیا اور برآمدے میں لٹکے ہوئے لوہے کے تاروں کے گملوں کی طرف دیکھنے لگا۔ جن میں بیلیں نکل کر نیچے کی طرف بڑھ آئی تھیں۔ اور ہلکے رنگوں کے پھول بالکل ساکن دکھائی دیتے تھے جیسے رقص کرتے کرتے ایک دم رُک گئے ہوں۔ گملوں میں سے اب بھی پانی رس رس کر بوند بوند کر کے نیچے گر رہا تھا۔

معاً ہنسی اور شور و غل کی آوازیں سن کر وہ چونک اُٹھا۔ اُس کی خاموش اور سنجیدہ دنیا سے یہ دنیا کس قدر علیحدہ تھی۔ یہ اُسی کے بچے تھے دو لڑکے اور تین لڑکیاں۔ سب سے بڑے لڑکے کی عمر اٹھائیس برس کے قریب تھی اُس کی شادی ہو چکی تھی۔ اُس سے چھوٹی لڑکی تھی۔ چوبیس برس کے قریب اُس کی بھی شادی ہو چکی تھی۔ اُس سے چھوٹی لڑکی کی عمر اُنیس برس کی تھی۔ اس سے چھوٹا چودہ سالہ لڑکا اور سب سے چھوٹی بارہ برس کی لڑکی۔ اِن میں اُس کے لڑکے کی نوجوان بیوی اور

اُس کا چھوٹا سا پوتا بھی شامل تھا۔ وہ سب لوگ ہنس کھیل رہے تھے۔ اور وہ خود تنہائی میں بیٹھا تھا۔ عرصہ دراز سے یہی سب کچھ ہو رہا تھا لیکن اُسے کبھی اِن باتوں کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ پہلے اُس کی زندگی بھرپور تھی۔ وہ کماتا رہا اور اپنے مشاغل میں محو رہا۔ اُس کے دوست تھے جن کے ساتھ یکجا کھانا اور پھر پینا بھی ہوتا تھا۔ اُن کی صحبت میں چنگ ورباب کی محفلیں بھی گرم ہوتی تھیں۔ سیر و شکار کی مہموں پر بھی جاتے تھے۔ گھر والوں سے اُس کا کچھ زیادہ تعلق نہ تھا۔ اُس کا ایک علیحدہ کمرا تھا۔ وہ اپنے وقت کا زیادہ حصّہ اِسی کمرے میں صرف کرتا تھا۔ یہیں اُس کے دوست بھی آ پہنچتے تھے۔ یہیں برج بھی کھیلی جاتی تھی۔

دوستوں سے فرصت پاتا تو پھر دفتر کا کام بھی تھا۔ اور کئی مسائل تھے جن پر سوچنا پڑتا تھا۔

وہ گھر میں سخت قسم کا ڈسپلن پسند کرتا تھا۔ بچے اُس کے پاس کم آتے تھے۔ وہ سخت طبیعت کا شخص تھا۔ اِس میں بھی شبہ نہیں کہ اُسے باپ ہونے کا غیر معمولی احساس تھا۔ وہ بلا ضرورت شاذ و نادر ہی بچوں سے بات چیت کرتا تھا۔ وہ گھر کے اندر بھی کم و بیش ہی داخل ہوتا تھا۔ اگر اُس کے بچوں میں سے کسی کو کسی شے کی ضرورت ہوتی تو وہ موقع پا کر اُس کے پاس آتا، مدعا بیان کرتا...... وہ بچوں کا رونا دھونا، اُن کی ضد اور شور و غل برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اِسی لئے اُس نے اپنا کمرہ بالکل علیحدہ کر رکھا تھا۔ بچوں کے لئے وہ ایک بلند مرتبہ اور افضل ہستی تھا جو کسی اونچے سنگھاسن پر متمکن تھا۔ اُس کے نزدیک جانا یا بلا وجہ اُس کے سامنے ہنسنا اور

باتیں کرنا وہ مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اپنے باپ کی عزت کرتے تھے۔
وہ اپنے بچوں کے اس رویہ سے بالکل مطمئن تھا۔ اُس نے بچوں کو بہت اچھی طرح سے پالا پوسا۔ اُن کی ضروریات کا خیال رکھا۔ اس طرح وہ ہمیشہ اُن کے لئے ایک بہت ہی بلند ہستی بنا رہا۔ اُسے خواب میں بھی خیال نہیں آیا کہ اس سے بڑھ کر بھی کسی شے کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ والدین اور اولاد کے مابین اس سے بھی قریبی تعلقات لازمی ہیں۔ اس کی اولاد نیک تھی۔ وہ سب بااخلاق، تعلیم یافتہ اور باادب بچے تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ان کے تعلقات میں کسی قسم کی کوئی کمی رہ گئی تھی۔

کچھ نئے قسم کے خیالات تھوڑے ہی عرصہ میں سے اُس کے دماغ میں کروٹیں لینے لگے تھے۔ اس کا جسم اب کمزور ہو چکا تھا۔ اب وہ پہلے کے مشاغل ترک کر چکا تھا۔ اتنی سکت ہی نہ تھی کہ وہ اِدھر اُدھر بھاگتا پھرے۔ اب اُس کے دوستوں میں بھی بوڑھے لوگ شامل تھے وہ لاٹھیاں ٹیکے ہوئے آتے اور پھر ان میں سے کسی کے ساتھ چہل قدمی کرتا ہوا شہر سے دُور چلا جاتا۔ ان بڈھوں میں سے بیشتر کو جوانوں سے کوئی نہ کوئی شکایت ضرور ہوتی تھی۔ وہ اپنا وقت زیادہ تر انھیں باتوں میں صرف کرتے تھے۔ یا پھر مختلف رشتہ داروں کی باتیں۔ گزشتہ زمانے کے قصے۔ یا وہی مادہ پرستوں کی بیکار روحانیت، پرم آتما اور آتما کا فرق تصوف اور ویدانت کا تعلق۔ اس طرح وہ اپنی علیحدہ دنیا میں پوپلے منہ ہلا ہلا کر باتیں کیا کرتے تھے اور ان باتوں کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلتا تھا بس یونہی دل کو ڈھارس دینے کے طریقے تھے۔ اُس کی طرح سب کو یہی

احساس تھا کہ اب ان کا کام ختم ہو چکا۔ اب انھیں آج کل میں بوریا بستر لپیٹ کر چل دینا ہے۔

لیکن دنیا کی محفل اب بھی گرم تھی۔ شمعیں اب بھی جلتی تھیں۔ پروانے اب بھی قربان ہوتے تھے۔ اس زندگی کے ہنگاموں میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا تھا .... تو بس یہی تھی زندگی؟ اسی کے لئے اس قدر شور وغل مچا ہوا تھا؟

اس محفل سے اس طرح بے آبرو ہو کر نکلنا کس قدر اذیت دہ تھا بھری محفل سے خارج کر دئے جانے والا بھی کس قدر دبے پاؤں آگے بڑھتا تھا۔ کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔ انسان کو ایک دم کھڑکی سے باہر نکال کر پھینک دیا جائے تو وہ ایک علیٰحدہ بات ہے۔ لیکن اس کے برعکس یہ عمل اس قدر آہستہ آہستہ ہوتا تھا اور یہ سارا قضیہ اس قدر طویل ہوتا تھا کہ انسان مارے اذیت کے بیخ اٹھتا تھا۔ پاگل ہو جاتا تھا۔ ...... انسان کو اس بات کا احساس دلایا جاتا تھا کہ اب وہ اس محفل کے قابل نہیں رہا۔ محفل اسی طرح گرم رہتی ہے۔ وہی ساقی، وہی جام وہی چنگ ورباب کی اڑتی ہوئی تانیں .... لیکن انسان بدل جاتا ہے۔ اسے اوروں کے لئے جگہ خالی کرنی پڑتی ہے اور اگر وہ یہ نہ کرے تو پھر نووارد اس کی چھاتی پر بیٹھ کر اپنا پروگرام جاری رکھتے ہیں۔ وہی شخص جو پہلے جانِ محفل تھا اب اس کا وجود محفل کے لئے باعثِ شرم ہو جاتا ہے۔ اسی لئے بیشتر بوڑھے پگڑیاں سنبھالتے ہوئے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے بھاگ نکلتے ہیں اور جو ضدی پکول کی طرح وہاں اڑے رہتے ہیں ان کی مٹی پلید ہوتی ہے۔

لیکن اِس ساری رنگین محفل کی رنگ رلیوں کی تہ میں کس قدر کمینہ پن اور درندگی کام کرتی ہے۔ رنگین پردوں کے پیچھے خوفناک درندے چھپے رہتے ہیں۔ مرصّع کرسیوں کے نیچے سانپ پھن پھیلائے جھوما کرتے ہیں۔ وہ سب سازش کے مطابق ایک ہی وقت شکار پر جھپٹتے ہیں۔

اُس نے ٹٹول کر قریب پڑی ہوئی تپائی سے سگریٹ کی ڈبیا اُٹھائی سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر اُسے سلگایا اور اُس کے اُڑتے ہوئے دھوئیں کی باریک چادر میں سے وہ مٹر کی بیلوں کی طرف دیکھنے لگا جو مڑی تڑی سی کیاریوں میں گرتی ہوئی چھڑیوں کے سہارے کھڑی تھیں۔

وہ ایک بے بس ٹوٹی ہوئی کشتی کی طرح کنارے پر ہچکولے کھا رہا تھا ــــــ اس قسم کی باتیں سوچ سوچ کر وہ پاگل ہوا جاتا تھا۔

پھر اُس کے خیالات اپنی بیوی کی طرف منتقل ہو گئے۔ اس کی بابت بھی اُس نے کبھی بہت زیادہ غور نہیں کیا تھا۔ وہ بھی ایک زمانے میں اُسی کی طرح جوان تھی .... جوبن کی متوالی اٹھکیلیاں کرتی پھرتی تھی۔ اکیلی بیٹھی ہوئی گیت گنگنایا کرتی تھی۔ اب وہ بھی بوڑھی تھی لیکن اُس کی صورت مضمحل نظر نہ آتی تھی۔ اُس پر کسی قسم کا شدید ردِ عمل نہ ہوا تھا۔ نہ اُس کا مزاج چڑچڑا تھا نہ وہ کبھی بڑبڑاتی تھی۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ خوش خوش رہتی تھی۔

وہ عورت کو کم عقل سمجھتا تھا۔ لیکن وہ سوچنے لگا کہ اگر اس کی کم عقلی ہی اُس کی دلی راحت کا موجب ہو رہی ہے تو پھر یہ حماقت ہی اچھی۔ ایک روز اُس نے دیکھا کہ اُس کا سب سے بڑا لڑکا ماں کی گود میں سر رکھے پلنگ پر لیٹا ہے۔ یہ ایک عجیب بات تھی۔ اُس کے سامنے اُس کا لڑکا

بھیگی بلّی بنا رہتا تھا۔ اب جبکہ وہ ایک بچے کا باپ بھی بن چکا تھا وہ کبھی اُس کے سامنے آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی جرأت بھی نہ کر سکتا تھا۔ لیکن اپنی ماں کے ساتھ وہ اس قدر بے تکلف تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ منظر دیکھ کر اُسے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ یہ عجیب قسم کی خوشی تھی۔ اتنا بڑا بال بچے دار لڑکا اپنی ماں کی گود میں چار سالہ بچے کی طرح سر رکھے لیٹا تھا۔

باہر کی محفلوں کی بابت تو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی خود اُس کے گھر کی محفل ابھی تک اُسی طرح گرم تھی۔ بلکہ پہلے کم تھی اور اب اُس کی رونق پہلے سے کہیں زیادہ ہو گئی تھی۔ بھائی بہنوں کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ناچا کرتے تھے۔ وہ ابھی تک ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے اور شور مچاتے تھے۔ کبھی کبھی جب اُسے بڑے زور زور سے پاؤں کی چاپ سُنائی دیتی تو وہ چپکے سے گھر کے اندر چلا جاتا۔ دُور ہی سے کسی پوشیدہ مقام سے دیکھتا کہ وہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ بھاگ کر ایک دوسرے کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ چیخیں نکلی پڑتی ہیں۔ اسی طرح بھاگم بھاگ کے بعد وہ تھک جاتے ہیں تو کوئی نیا کھیل کھیلنے کی تجویزیں سوچنے لگتے ہیں۔ اُن کی ماں بھی اُن کے کھیلوں میں شامل ہو جاتی ہے۔ وہ اُن میں کھیلتی بھدی ہرگز نہیں دکھائی دیتی۔

جب وہ آنکھ مچولی کھیلنے لگتے۔ تو کہتے "آؤ ماں، آنکھ مچولی کھیلیں۔۔۔۔۔۔"

"بھئی مجھ سے نا کھیلی جائے آنکھ مچولی۔ اب میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ بس تم ہی کھیلو آپس میں۔۔۔۔۔"

لیکن اس کی بیٹیاں اور بیٹے کب چھوڑتے تھے اُسے ۔ نتیجہ یہ کہ ماں کو بھی بھاگنا دوڑنا پڑتا ۔ اُسے بھی چور بن کر دائی کے قریب آنکھیں بند کر کے کھڑے ہونا پڑتا تھا ۔ اس کے چھوٹے بچوں سے لے کر بڑوں تک کسی کو یہ احساس نہ تھا کہ اب اس قسم کے کھیل کھیلنے کی ان کی عمر نہیں رہی ۔ نہ انھیں خود اس بات کا احساس تھا اور نہ وہ اپنی ادھیڑ عمر کی ماں ہی کو اس قسم کا احساس ہونے دیتے تھے ۔

پہلے تو نہ کبھی اُسے تنہائی کا احساس ہوا نہ اُس نے کبھی ان باتوں پر غور ہی کیا ۔ لیکن جب باہر کی دنیا کے دروازے اس کے لئے بند ہو گئے تو اُس نے اپنے اندر جھانکنا شروع کیا ۔ کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ بھی اپنے بچوں کے کھیلوں میں شامل ہو جائے ۔ یقیناً وہ ایسا کمزور تو نہیں تھا کہ تھوڑی دوڑ بھاگ بھی نہ کر سکے ۔ وہ چلا سکتا تھا گا سکتا تھا ۔ ناچ سکتا تھا ......"

وہ سوچنے لگا کہ شاید ہم بچے پیدا کر کے انھیں بھول جاتے ہیں کہ ان کی رگوں میں بھی تو ہمارا ہی خون رواں ہے ۔ ہم ہی نے انھیں جنم دیا ہے ۔ شاید ہم کبھی بوڑھے نہیں ہوتے ۔ سدا بہار ہی رہتے ہیں ۔ ہماری پیدا کردہ ہستیاں ہمیں کبھی بڑھاپے اور زندگی کی ناپائداری کا احساس نہ ہونے دیں ' اگر ہم ان پر یہ بات ظاہر کر دیں کہ صرف ہمارا ہی اُن پر حق نہیں ہے اُن کے بھی ہم پر حقوق ہیں .... اِس طرح یقیناً وہ ہمیں اپنے کھیلوں میں شامل کر لیں گے ۔ ہمارے دماغ سے یہ خیال ہی نکال دیں گے کہ ہم کوئی غیر ہیں ۔ ہمارا علیحدگی کا احساس ہی مٹ جائیگا ۔

وہ اس بات پر جس قدر غور کرتا تھا اُسی قدر ایک نئی دنیا اُس کے

سامنے روشن ہوتی جاتی تھی۔ زندگی کا یہ نیا رُخ اُسے بہت ہی دلفریب نظر آرہا تھا۔ یہ کوئی بہت مشکل اور پیچیدہ مسئلہ نہ تھا۔ آخر اُسے اپنی انفرادیت پر اس قدر زیادہ اصرار کیوں تھا؟

رفتہ رفتہ اُسے یقین سا پیدا ہونے لگا کہ اس بات کا حل جسے سوچ سوچ کر وہ باولا ہوا جاتا تھا اس قدر مشکل نہیں تھا۔

اتنے دنوں تک وہ گمراہ رہا۔ اب بھی وہ واپس جا سکتا تھا۔ ابھی کچھ بگڑا نہیں تھا۔ لیکن اُس کے دل میں کچھ ہچکچاہٹ تھی۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ اپنی لڑکیوں اور لڑکوں کے ساتھ کو دپھاند کرنے لگے۔ وہ آج تک اُن کے سامنے ضرورت سے زیادہ ہنس کر بولا تک نہ تھا۔ اب یک بیک وہ کیونکر بدل جائے۔

وہ چپ چاپ سگریٹ کا دھواں اُڑاتا رہا۔ اُس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو رہا تھا۔ لیکن کچھ جرأت کی ضرورت تھی۔ وہ سر پہ ہاتھ پھیر پھیر کر تصور میں اپنا ناچنا کودنا دیکھ رہا تھا۔ اُس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ کتنی معمولی بات تھی۔ بس وہ لاٹھی ٹیکتا ہوا دفعتہً اپنے گھر والوں کے روبرو پہنچ جائے۔ آخر وہ اُسی کے بچے تو تھے۔ وہی ننھے ننھے بچے جو کبھی توتلی زبان میں باتیں کیا کرتے تھے۔ اب بڑے ہو گئے تو کیا ہوا۔ وہ بڑے اپنے لیئے ہوں گے اُس کے لئے تو وہ وہی کل کے بچے تھے۔

اندر سے زور زور باتیں کرنے، گانے اور قہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ کارواں چلا جا رہا تھا۔ وہ خواہ مخواہ بے کارواں ہو کر اس تاریک کونے میں منہ چھپائے بیٹھا تھا۔ وہ اُس کے اپنے جسم کے

ٹکڑے تھے وہ جو شاداں و فرحاں گیت گاتے چلے جا رہے تھے۔
آخر وہ اپنے آپ کو ان سے نوچ کر علیحدہ کیوں ہو بیٹھا تھا.... ؟
اتنے میں اُس کے سب سے بڑے لڑکے کے قہقہے کی آواز بلند ہوئی....۔

وہ یہ قہقہہ سن کر چونک اٹھا اُس کے لڑکے کی آواز اور اُس کی اپنی آواز کس قدر زیادہ مشابہ تھی۔ اُس کے دوستوں نے خود اِس بات کا کئی مرتبہ اعتراف کیا تھا کہ اُس کا لڑکا جب ہنستا تھا تو اُن کو دھوکا ہو جاتا تھا........ اُس کا بیٹا کسی بات پر قہقہے لگائے جا رہا تھا۔ اُس کی آواز میں کس قدر مسرت اور اطمینان کا احساس ہوتا تھا۔ کوئی فکر نہیں، فاقہ نہیں، بناوٹ نہیں ایک الھڑ نوجوان کی بیباک ہنسی........ جیسے خود اُس کی روح کسی نئے جسم میں سما گئی ہو.......... اُسے ایک نئی مسرت کا احساس ہونے لگا۔ یہ بات بھی کس قدر خیال انگیز تھی کہ اُس کی روح۔ نئے قالب میں داخل ہو کر بالکل مطمئن اور خوش تھی........ ایک روز اُس کا لڑکا بوڑھا ہو جائے گا...... اُس کی روح پھر بھی کسی نئے قالب میں اطمینان اور مسرت کے ساتھ چھپی رہے گی........ اور اِس طرح ابد تک.......

اُس نے خاموش درختوں کی طرف دیکھا جن کی نازک کونپلیں متحرک دکھائی دیتی تھیں۔ گہرے سکون کے بعد زندگی کے آثار دکھائی دینے لگتے تھے۔

سگریٹ کا بچا ہوا چھوٹا سا ٹکڑا اُس نے پرے پھینک دیا اور لاٹھی ٹیک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے جھک کر اپنی ٹانگوں کو ٹٹولا وہ ابھی مضبوط تھیں

اُس کی قوتِ بینائی خاصی تھی۔ اُس کی آواز بھرپور تھی۔ وہ سب کچھ کر سکتا تھا۔

آہستہ آہستہ لاٹھی ٹیکتا ہوا مکان کے اندر والے کمروں کی طرف بڑھا .... وہ رنگین قہقہے جو دور سے ذرا مدھم سنائی دیتے تھے نزدیک پہنچ کر واضح طور پر سنائی دینے لگے۔ اُس کا ذہن اِن پُرمسرت قہقہوں اور چیخوں میں گھل مل کر مسرور ہو اُٹھا۔

وہ تاریکی سے اُٹھ کر اِدھر آیا تھا۔ جوں جوں آگے بڑھتا گیا روشنی زیادہ ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ اس کمرے کے عین قریب پہنچ گیا جہاں وہ سب ہنس کھیل رہے تھے۔ وہ دروازے کے پردے کو اُٹھانے ہی لگا تھا کہ ٹھٹک کر رہ گیا۔

سامنے اُس کی بیوی گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بڑے پلنگ پر بیٹھی تھی۔ اُس کا سب سے بڑا بیٹا ماں کی گود میں سر رکھے ہوئے لیٹا تھا۔ اور اُس کے ہاتھوں میں اُس کا ننھا سا بچہ تھا۔ وہ اُسے دونوں ہاتھوں میں تھامے ہوا میں بلند کئے ہوئے تھا۔ بچہ بہت خوش ہو رہا تھا۔ اُس کی ایک لڑکی پلنگ کے پیچھے سے آگے کو جھکی ہوئی اپنی ماں کو اپنی باہوں میں جکڑے ہوئے تھی۔ اُس کی بہو پرے کرسی پر بیٹھی سویٹر بُن رہی تھی۔ ایک لڑکی ہاتھ اُٹھائے کولھوں کو ہلا رہی تھی اور کہہ رہی تھی " بھلا ساودھنا بوس کیسے ناچتی ہے بتاؤں؟ یہ کہہ کر وہ بڑے بانکپن سے کمر اور بازو ہلانے لگی۔ عین اُس کے پیچھے اُس کا چھوٹا بھائی کھڑا اُس کی چوٹی کپڑے کے بنے ہوئے کتے کی دُم کے ساتھ باندھنے کی فکر میں تھا۔ اُس کے چہرے

غضب کی شرارت ٹپک رہی تھی ۔ باقی لوگ اُس کی اس حرکت کو تاڑ رہے تھے ۔ وہ ناچنے والی کا دھیان بٹائے ہوئے تھے ۔ تاکہ یہ شرارت کامیاب ہو سکے ۔ اُس کی سب سے چھوٹی لڑکی دری پر لیٹی ہاتھوں ہی ہاتھوں سے بھائی کو گرہ دینے کے اشارے کر رہی تھی ۔ ادھر گرہ بندھ گئی اُدھر ہوا میں اُچھلے ہوئے بچے کی رال ٹپک کر اُس کے باپ کی ناک پر جا گری ۔ ان دونوں پر ایک ساتھ ہی ایسا ہلڑ مچا کہ بس توبہ ہی بھلی ......"

وہ باہر کھڑا کھڑا کل تماشہ دیکھ رہا تھا ۔ اس ہلڑ کے درمیان وہ پردہ ہٹا کر کمرے کے اندر چلا گیا ۔

ایک لمحہ کے لئے تو اُسی طرح شور غوغا مچا رہا ۔ لیکن دفعتہً سب ایک دم چپ ہو گئے ۔

بڑا بیٹا ماں کی گود سے سر ہٹا کر ایک دم سیدھا کھڑا ہو گیا ۔ وہ لڑکی جس کی چوٹی سے کتا بندھا ہوا تھا ایک کونے میں دبک گئی ۔ اور وہ لڑکا جس نے کتا باندھا تھا کچھ خوفزدہ سا ہو کر مودبانہ کھڑا ہو گیا ۔ باقی لڑکیاں بھی آنچل سنبھالتی ہوئی اِدھر اُدھر ہو گئیں ۔ اُس کی بیوی بھی پلنگ سے نیچے اُتر آئی ۔

کمرے میں اس قدر مکمل خاموشی طاری ہو گئی کہ اگر فرش پر سوئی بھی گرتی تو اُس کی آواز سنائی دیتی ۔

وہ پہلے کبھی اس طرح دفعتہً کمرے میں داخل نہ ہوا تھا ۔ سب بچے کچھ اس طرح سہمے ہوئے نظر آ رہے تھے جیسے چڑیوں کے گھونسلے میں باز آن گھسے ۔

اُس نے چھپی نظروں سے سب کی طرف دیکھا۔ وہ سب نظریں جھکائے زمین کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے اُن کے ہاتھوں سے کوئی بڑا بھاری گناہ سرزد ہو گیا۔

جیتے جاگتے انسانوں کے اِس کمرے میں یہ قبرستان کی مکمل خاموشی اُس کے تنہا گوشے کی خاموشی سے کہیں زیادہ اذیت دہ اور روح فرسا تھی۔

جھُرجھُری

لالہ رام لبھایا ــــــ لالہ' ہاں لالہ۔ اب وہ لالہ ہی تھا۔ کبھی لوگ اُسے مسٹر رام لبھایا کہہ کر بھی بلایا کرتے تھے...... لیکن یہ اُن دنوں کی بات ہے جب آتش جوان تھا..... مسٹر سے لالہ وہ خود بخود ہی بن گیا۔ پہلے اُس کی صورت ایسی ہی تھی جیسی کسی مسٹر کی ہونی چاہیئے۔ لیکن نہ معلوم کیسے لوگوں کو جب اُس کی صورت سے لالہ پن کے آثار دکھائی دینے لگے تو اُنھوں نے اُسے لالہ رام لبھایا کہہ کر بلانا شروع کر دیا ــــــ خیر، تو لالہ رام لبھایا نے جب زندگی شروع کی تو وہ جونیئر کلرک تھا۔ اور اب جب کہ وہ زندگی کے اس پار آن پہنچا تھا وہ ہیڈ کلرک بن چکا تھا...... اُسے اِس بات کا علم نہیں تھا کہ اُس کے آگے آسمان اور بھی ہیں...... لیکن اگر اُسے اِس بات کا علم ہوتا بھی تو وہ "آسمان" چونکہ اُس کے لئے نہیں تھے اِس لئے ظاہر ہے کہ

اُس پر اس بات کا کچھ اثر نہ پڑتا تھا۔
اُس کی ساری عمر سالانہ اضافہ اور ترقی وغیرہ کی بابت سر دُھننے میں گزر گئی۔۔۔۔۔۔ یہ کل ہی کی بات تو تھی جب وہ جونیئر کلرک مقرر ہوا۔ آج کل کے چھچھورے نوجوان تو کلرکی کے نام ہی سے بھاگتے ہیں۔ لیکن ان دنوں یہ ایک بہت بڑا رتبہ سمجھا جاتا تھا اُس کا باپ فخر سے لوگوں کو بتایا کرتا تھا کہ اُس کا بیٹا کلرک ہو گیا ہے۔ اور لطف یہ کہ لوگ یہ سن کر واقعی مرعوب ہو جاتے تھے۔
لیکن ایک روز جب رام لبھایا دفتر سے واپس آکر اپنے کوارٹر کے چھوٹے سے برآمدے میں سرکنڈوں کی گول سی کرسی پر دونوں ٹانگیں سمیٹے آرام سے بیٹھا تھا۔ حقے کی نے اُس کے دانتوں میں دبی ہوئی تھی اُس نے بیٹی کو پکارا "بیٹی! چلم نہیں بھری ابھی تک؟" ۔۔۔۔۔۔ اُس کا نشہ ٹوٹتا جا رہا تھا۔ یوں تو وہ دفتر میں بیڑیاں اور کبھی کبھی سگریٹ بھی پیا کرتا تھا لیکن اُس کے دل کو تسکین نہیں ہوتی تھی پہلے زمانے بھی اچھے تھے۔ جب لوگ بغلوں میں حقے دباتے اپنے کاموں پر جایا کرتے تھے۔ چاہے کھیتی باڑی کا کام ہو، مزدوری ہو، اپنی دوکان ہو، کچھ بھی ہو حقہ ساتھ رہتا تھا۔ لیکن نئی روشنی میں لوگوں کے سب اُصول ہی بدل گئے تھے۔ کیا ہرج تھا اگر اُس کا حقہ اُس کی میز کے قریب پڑا رہتا۔ آہا! پھر دفتر بھی سورگ بن جاتا۔ اِسی لئے تو اب دفتر میں اُس کا جی نہیں لگتا تھا۔ اِدھر چھٹی ہوئی اور اُدھر وہ رسی تڑاکر ایسا بھاگا کہ بس گھر ہی پر دم لیا۔۔۔۔ ۔۔۔۔ لیکن یہ چھوکری ــــ اور وہ پھر آواز دینے ہی کو تھا کہ اُس کی

لڑکی ہاتھ میں چلم اُٹھائے برآمدے میں داخل ہوئی۔ اُس نے جب اُس کی طرف دیکھا تو اُس کی آنکھیں جھپک گئیں۔

لڑکی تو چلم رکھ کر چلی گئی۔ لیکن وہ گہرے گہرے کش کھینچتے وقت اپنے خیالات میں کھو گیا۔

اب اُس کی لڑکی جوان ہو گئی تھی...... وہ عرصہ سے جوان ہو رہی تھی۔ اُس کی بیوی نے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا لیکن اب تک وہ سُنا اَن سُنا اور دیکھا اَن دیکھا کرتا رہا۔ لیکن آج اُسے اِس بات کا یقین ہو گیا کہ راہِ فرار کی اب کوئی صورت باقی نہیں رہی۔

اُس کی جوان بیٹی کے پاؤں کی دھمک سے زمین ہلتی دکھائی دیتی تھی۔ اُس کا جسم سڈول اور بھرپور ہو چکا تھا۔ ہر چند وہ سینہ دُہرے دوپٹے تلے چھپائے رکھتی تھی۔ چلتی بھی تو ذرا آگے کو جُھک کر لیکن اُس کی چھاتیاں...... وہ انھیں نوچ کر کہاں پھینک دے ان کا اُبھار چھپائے نہ چھپتا تھا۔ اُس کے کپڑے بالکل سادے ہوتے تھے، مانگ بالوں کی عین بیچ میں سے نکلی ہوتی تھی۔ آنکھیں کاجل کی سیاہی سے بے نیاز رہتی تھیں۔ زبان پر تالا پڑا رہتا، نظریں زمین میں گڑی رہتی تھیں......کوئی شوخی، کوئی شرارت، کوئی بناؤ سنگھار، کوئی اٹکھیلیاں نہیں۔ لیکن شباب چیخ چیخ کر اپنا اعلان کر رہا تھا..... اور یہ شور دن بدن بڑھتا گیا۔

لالہ رام لبھایا بھوچکا سا رہ گیا۔ زمانہ اتنی جلدی کروٹ بدلتا ہے؟ آنکھ جھپکتے بچپن شباب، شباب پیری میں تبدیل ہو جاتا ہے؟

اسی کوارٹر میں اُس کی بیوی نئی نویلی دُلھن بن کر آئی تھی۔ اب وہ چار بچوں کی ماں، ڈھیلے ڈھالے پیٹ اور چپاتی کی طرح لٹکتی ہوئی چھاتیوں والی عورت تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن رام لبھایا یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ اکدم اس قدر بوڑھی کیوں کر ہو گئی۔ جب وہ اُسے بیاہ کر لایا تھا تو شب و روز پروانے کی طرح بیوی کے ارد گرد منڈلایا کرتا تھا۔ وہ ایک سیدھی سادی دیہاتی عورت تھی۔

سامنے سفیدی پھری مٹی کے بنے ہوئے کرشن جی کھڑے بنسری بجا رہے ہیں۔ اُن کے تاج میں لگا ہوا مور کا پر بھدے سے سبز رنگ سے بنایا گیا ہے۔ سمگروں نے پاؤں میں گھنگرو باندھ دئے ہیں۔ لیکن کرشن جی گھنگرو تو نہیں باندھتے تھے پاؤں پر۔ ممکن ہے کچھ اور ہی ہو۔ پھولوں کے گجرے ہوں شاید۔ آخر اس زرد رنگ سے انسان کیا سمجھ سکتا تھا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پرے وہی پرانی تصویر تھی۔ وہ بچارے کوئی رشی جی تھے۔ اُن کی تپشیا بھنگ کرنے کے لئے ایک پری زمین پر اُتری اُس نے رشی جی کے سامنے رقص کیا۔ رشی جی عورت کے تیر نگاہ کے گھائل ہو گئے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُن کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی اب رشی کو ہوش آیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پری بچی کو آگے بڑھا کر اُس کی گود میں دے دینا چاہتی تھی رشی جی ایک ہاتھ اوپر اُٹھا کر اُسے اپنے سے دُور رہنے کی ہدایت کر رہے تھے اور خود جنگلوں کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔

اور تو اور پاندان کے قریب مٹی کا بنا ہوا ایک بینگن بھی پڑا تھا یہ بینگن بالکل اصلی کی مانند نظر آتا تھا۔ اُس کی بیوی تو واقعی اُس کو

بالکل اصلی بینگن سمجھ بیٹھی تھی۔ اور جب اُسے معلوم ہوا کہ وہ اصلی بینگن نہیں بلکہ مٹی کا بنا ہوا ہے تو وہ ہکا بکا رہ گئی۔

اُن دنوں جب کبھی اُس کے دفتر کے دوست آواز دے کر بلاتے "مسٹر رام لبھایا! آئیے نا! ذرا گھوم آئیں۔۔۔۔"

اُس وقت وہ اپنی بیوی کو گود میں بٹھائے ہوتا تھا۔ اُسے ان دوستوں پر بہت سخت غصہ آتا تھا۔ لیکن قہر درویش بجانِ درویش بچارا چل کھڑا ہوتا۔ اگر نہ جاتا تو دوسرے روز اُسے زن مرید کہہ کر آوازے کسے جاتے۔

وہ اس زمانہ کی یاد مکمل طور پر تازہ کر سکتا تھا۔ وہ گڑ کی مکھی کی طرح ہمیشہ بیوی سے چپکا رہتا تھا۔ اور پھر اُس کی بیوی نے بچے دینے شروع کئے پے در پے جیسے زلزلے کا جھٹکا لگنے پر پہاڑ سے چٹانیں لڑھکنے لگیں۔

پہلی مرتبہ جب اُس کی بیوی کا پیٹ پھول گیا تو وہ بہت خوش ہوا۔ وہ ایک دبلا پتلا اور دَبّو سا شخص تھا۔ اُس نے زندگی میں نہ کبھی کبڈی کھیلی تھی نہ کشتی لڑی تھی۔ نہ کبھی کوئی نظم کہی تھی نہ کوئی تصویر بنائی تھی اُس نے کوئی بھی ایسا کام نہ کیا تھا جس سے لوگوں میں واہ واہ ہوتی لیکن اُس نے اپنی عورت کا پیٹ بڑا کر دیا تھا۔

اسی طرح وہ ایک کرسی پر بیٹھا حقے کی نے دانتوں تلے دبائے دھوئیں کے بادل اُڑایا کرتا تھا اور کنکھیوں سے گھر میں چلتی پھرتی بیوی کے پیٹ کی طرف دیکھا کرتا تھا جس کی جلد خوب تن کر چکنی سی دکھائی دینے لگی تھی۔

ایک روز اُس کی بیوی نے ایک بچہ اُگل دیا۔۔۔۔ وہ بیتابی سے

پر آمدے میں ٹہل رہا تھا۔ پیٹ کا پھیلاؤ دیکھ کر تو اُسے خیال پیدا ہوتا کہ اس میں سوائے لڑکے کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن جب اُسے معلوم ہوا کہ اُس کے ہاں لڑکی ہوئی ہے تو اگرچہ اُس کے دل کو خاص خوشی محسوس نہ ہوئی لیکن اس کے ساتھ ہی وہ مایوس بھی نہیں ہوا۔ یار زندہ صحبت باقی۔

یہی وہ پہلی لڑکی تھی جو اب خود نیچے دینے پر تلی ہوئی تھی۔۔۔ پہلے پہل یہ بچی کس قدر معصوم اور بے ضرر ننھی سی جان نظر آتی تھی۔ وہ اس کے لئے بازار سے لوہے کی جالی کا بنا ہوا مضبوط پنگوڑا لے آیا۔ اُس کی بیوی نے ایک چھوٹا سا گدیلا سی کر پنگوڑے میں بچھا دیا۔ حقیقت یہ تھی اس کی بچی ان کو ذرا دق نہ کرتی تھی۔ نہ وہ روتی تھی نہ چیختی تھی نہ چلاتی تھی۔ بس چپکے سے پنگوڑے میں پڑی ہاتھ پاؤں چلایا کرتی تھی اور چھت کی طرف نہ معلوم کیا کچھ دیکھ دیکھ کر خود بخود ہی ہنسے جاتی تھی۔ اُس کی بیوی نے کئی مرتبہ اِس بات کا ذکر کیا کہ اُن کی بچی بہت ہی اچھی تھی۔ اور پھر بھاگوان بھی کیونکہ جب وہ پیدا ہوئی تو کچھ ہی روز بعد اُس کی تنخواہ میں بھی کچھ اضافہ ہو گیا۔ بیوی نے جب یہ خوشخبری سُنی تو کہنے لگی " ایشور بڑا دیالو ہے۔ وہ پتھر کے کیڑے کو بھی کھانے کو دیتا ہے۔ یہ بچی اپنا نصیب اپنے ساتھ لائی ہے۔ ادھر یہ پیدا ہوئی اُدھر تنخواہ میں ترقی ہو گئی۔

وہ اُسے بھاگوان ہی سمجھتے رہے۔ وہ پنگوڑے میں پڑی رہنے والی بے ضرر بچی دھواں بن کر اوپر کو اُٹھنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ سارے آسمان پر چھا گئی۔ وہ ایک خاموش آندھی بن کر اُنھیں ڈرانے لگی۔

اتنے وسیع و عریض آسمان سے وہ خوفناک آنکھوں سے اُن کی طرف گھورنے لگی اُس کے جبڑے ہلنے لگے۔ جیسے وہ ان کو اپنی آنکھوں میں سے نکلنے والی جوالا میں بھسم کر کے اُن کی راکھ تک اُڑا دے گی یا جیسے وہ اپنے ہلتے ہوئے جبڑوں میں پیس کر رکھ دے گی۔

وہ سہم گئے۔ وہ ہر طرف پھیلی ہوئی تاریکی میں اندھوں کی طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ لحظہ بہ لحظہ طوفان بڑھتا آرہا تھا۔ اُس کی آمد بتدریج بھی تھی اور دہشت ناک بھی........

لالہ رام لبھایا کو اُس دن زندگی میں پہلی مرتبہ معاملے کی نزاکت کا احساس ہوا۔ وہ تھوڑی دیر تک حقہ پیتا رہا اور اُس کے ساتھ ساتھ سوچتا بھی رہا۔ بڑی دُور دُور تک دماغ دَوڑایا۔ لیکن اِس سوچ بچار کا کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ پھر اُس نے حقّہ سرکا کر ایک طرف رکھ دیا اور سلیپر گھسیٹتا ہوا باورچی خانے کی طرف بڑھا۔ صحن میں اُس کے چھوٹے تین بچے کھیل رہے تھے۔ اُس کی بیوی نے بچے بڑی فراخدلی سے دیئے تھے لیکن ان میں سے بیشتر چھوٹی عمر ہی میں مر گئے۔ اس وقت اُس کی بڑی بیٹی لوکی کو کدوکش پر رگڑ رہی تھی۔ نیچے تھالی میں لوکی کے بل کھاتے ہوئے لچھے جمع ہو رہے تھے۔ گویا آج کدو کا رائتہ تیار ہو رہا تھا۔ اُسے کدو کا رائتہ پسند تھا۔ بڑی بیٹی نے کدوکش دونوں پیروں سے دبا رکھا تھا۔ اُس کی ساری ذرا اوپر کو کھسک گئی تھی۔ وہ اُس کے ٹخنے اور گول گول پنڈلیوں کے نصف حصے دیکھ سکتا تھا۔ اسی سے وہ اُس کے جسم کی صحت اور بھوک کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ بیٹی کی آنکھوں سے آنکھیں ملانے کی اُسے ہمت ہی نہ ہوئی۔ وہ چپکے سے دھوتی سنبھالتا ہوا باورچی خانے

میں گھس گیا۔

اُس کی بیوی رائتے کے لئے دہی بلو رہی تھی۔ یہ اُس کے قریب چپکے سے ایک چوکی پر بیٹھ گیا اور پھر چولھے میں جلتی ہوئی لکڑی کی کھپچی میں سے ایک بے ڈول سا تنکا توڑ کر کان کریدنے لگا۔ اُس کی بیوی نے دہی میں تھوڑا سا دودھ ملا دیا۔

"بھئی یہ کیا کرتی ہو؟"

بیوی نے اُس کی صدائے احتجاج کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا "دہی کھٹّا ہے دودھ ملانے سے اِس کا مزا بہت اچھا ہو جائے گا۔۔"

اُس کا چھ سالہ لڑکا اندر آ گیا۔ اُس نے سر پر ایک لمبوتری سی کاغذ کی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ وہ باپ کو ٹوپی دکھانے آیا تھا۔ باپ کے دماغ میں اور ہی طوفان برپا تھا۔ اُس نے بیوی کے دوپٹے کے آنچل سے اُس کی ناک صاف کر دی "جاؤ بیٹا کھیلو۔۔۔۔۔۔۔ ہاں بھئی واہ واہ کیا شاندار ٹوپی ہے۔۔۔۔۔۔ جاؤ۔"

"ہائے رام یہ کیا کیا آپ نے میرے دوپٹے سے اُس کی ناک پونچھ ڈالی۔ ابھی نیا نکال کر سر پر رکھا تھا۔۔۔۔۔۔۔ آج ہمارے یہاں شیلو کی ماں آنے والی ہے۔"

"شیلو کی ماں؟"

"ہاں آ رہی ہے وہ اُس کے ساتھ اور عورتیں بھی ہوں گی۔۔۔۔۔۔۔۔" پھر اُس نے بیٹی کو آواز دے کر کہا "لاری لوکی مجھے دیدے تو منہ ہاتھ دھو کر کپڑے پہن لے نا۔"

رام لبھایا کا دل کھٹکا۔ کچھ دریافت کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

وہ جاننا چاہتا تھا کہ "کیا کوئی خاص بات ہے"

"کبھی آپ سا غافل بھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ وہ لڑکی کو دیکھنے کے لئے آرہے ہیں...... آخر آپ اتنی گرمی میں چولہے کے پاس کیوں بیٹھے ہیں...... ہائے رام آپ نے دفتر سے آکر کچھ کھایا بھی تو نہیں، کیا کھائیں گے...... مجھے آج بہت سا کام کرنا ہے۔ مہمانوں کے لئے مٹھائی بھی منگوانی ہوگی۔ تھوڑی سی مٹھائی ہو، چار یا ہو اور ساتھ کچھ نمکین چیز...... سموسے یا دال موٹھ......"

وہ اٹھ کر چلا آیا۔ اُسے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اُس کی بیوی ایک عملی عورت تھی۔ وہ نہ صرف سوچتی تھی بلکہ ہمت سے کچھ کام بھی کئے جا رہی تھی۔ وہ دوبارہ اپنی سرکنڈے کی کرسی پر آن بیٹھا۔ جلائے ہوئے اُپلے کے ٹکڑوں کو ہلایا اور پھر لمبے لمبے کش لینے لگا۔ اُس نے دفتر میں برسوں بڑی کامیابی سے کام کیا تھا۔ بڑا صاحب ہمیشہ اس سے خوش رہتا تھا۔ یہ اُسی کی نظرِ عنایت کا کرشمہ تھا کہ وہ بیالیس برس کی عمر ہی میں ہیڈ کلرک بن گیا۔ دفتر میں کوئی بات ہو بس ہیڈ کلرک صاحب سے پوچھو۔ وہ دفتر کا پرانا کام کرنے والا تھا۔ اُس سے کونسی بات پوشیدہ تھی۔ اور اپنے نیچے کام کرنے والے جونیئر اور سینیئر کلرکوں کو وہ سالہا سال تک پڑھا سکتا تھا لیکن اپنے گھر میں اُس کی ایک نہ چلتی تھی۔

وہ گھریلو معاملات میں تھا بھی بدھو۔ جب بیوی نے اُسے "غافل" کہا تھا تو در اصل وہ اُسے اول درجے کا احمق کہنا چاہتی تھی۔ لیکن اُس نے یہ بات کہی نہیں۔ وہ پتی برتا استری تھی نا۔ لالہ رام لبھایا کو

اپنی بے بضاعتی کا شدید احساس ہونے لگا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ لڑکیوں کی شادی پر والدین کے گھر اُجڑ جاتے ہیں۔ پہلے زمانے میں لڑکیاں بکتی تھیں۔ اب لڑکے بکتے ہیں۔ لڑکیوں میں پہلے تو دنیا بھر کے اوصاف تلاش کرتے ہیں۔ بہت حسین و طرحدار ہو۔ کھانا پکانے اور سینے پرونے سے بخوبی واقف ہو۔ ہنس مکھ اور پتی برتا ہو۔ پڑھی لکھی ہو، گانا بجانا بلکہ اگر ہو سکے تو ناچنا بھی جانتی ہو۔ اور اگر سب شرائط پر لڑکی پوری اُترے تو پھر آخری سوال یہ کیا جاتا ہے کہ " ہاں صاحب! لڑکی کے ساتھ کیا دوگے؟"

یہ باتیں سوچ سوچ کر رام لبھایا کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ شاید اُس کی بیوی نے اِن سب باتوں پر غور کر لیا ہو اور اس کا حل بھی نکال لیا ہو۔

اُس روز جب وہ سیر کے لئے باہر جانے لگا تو مہمان عورتیں اُس کے گھر میں داخل ہوئیں۔ وہ سیر کرتا ہوا دُور تک چلا گیا۔ اپنے خیالات میں غلطاں جب وہ اسٹیشن پر پہنچا تو اُس نے سوچا پلیٹ فارم پر کے بک اسٹال تک چکر ہی لگا آؤں۔ پلیٹ فارم پر پہنچ کر لوگوں کی گھما گھمی میں چند لمحوں کے لئے اُس کا دل بہل گیا۔ وہ بک اسٹال پر رسائل اور کتابوں کی ورق گردانی کرتا رہا۔ پھر وہ بڑے پل پر چڑھ گیا۔ رات ہو چکی تھی۔ تاروں کی مدھم روشنی میں ریلوے کی لائنیں دُور دُور تک چمکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ بل کھاتی، پھیلتی اور سمٹتی ہوئی لائنوں کو دیکھ کر اُسے زندگی میں پہلی مرتبہ اس بات کا احساس ہوا کہ اِن لوہے کی لائنوں کا بھی ایک خاص حسن ہے اِدھر اُدھر بیکار کھڑے ہوئے ڈبوں سے بہت پرے آسمان میں اُٹھے اونچے اونچے کھمبوں پر سگنل کی سُرخ سُرخ روشنی کس قدر بھلی معلوم ہوتی تھی۔

وہ بہت دیر تک اُس جگہ کھڑا رہا۔ اُسے مدھم روشنی میں اِدھر سے اُدھر آتے جاتے ریلوے کے بھاری بھرکم انجن جاندار دکھائی دیتے تھے اُن کی آوازیں ایسی تھیں جیسے کوئی عظیم الجثہ جانور بھاری بوجھ تلے ہانپ رہا ہو۔ لیکن یہ آہنی جانور بھی مصروف تھے۔ انھیں دن رات کام کرنا پڑتا تھا۔ انسان نے زندگی کی تگ و دو میں بے جان چیزوں کو بھی شامل کر لیا تھا۔ لوہے، بھاپ اور بجلی کو بھی انسان کے کاموں سے فرصت نہ تھی۔ اور انسان نے "کیوں اور کہاں" کہنا تو چھوڑ ہی دیا تھا۔ پہلے اُنھوں نے مشینوں کو اپنا غلام بنایا اور پھر وہ خود مشینوں کے ہاتھوں غلام بن کر رہ گئے۔ لیکن یہ سب کچھ کس قدر بوجھل اور بے کیف معلوم ہوتا تھا۔ وہ فلاسفر نہ تھا۔ لیکن مختصر پیمانے پر ہر شخص فلاسفر ہوتا ہے۔ سڑکوں پر چھڑکاؤ کرنے والا سقہ، مکئی بھوننے والا بھڑبھونجہ، چنے اور کلچے بیچنے والا دکاندار غرض ہر کسی کا کوئی نہ کوئی اپنا ہی فلسفہ ہے۔ وہ کئی مرتبہ فلاسفروں کی طرح سوچتے اور اُنھیں کی طرح باتیں بھی کرتے ہیں۔

جب وہ گھر پہنچا تو بیوی کا چہرہ کچھ اُترا ہوا تھا۔ بچے روٹی کھا چکے تھے اُس وقت وہ صحن میں چارپائیوں پر بیٹھے بڑی بہن سے کہانی سننے پر اصرار کر رہے تھے۔ وہ سیدھا باورچی خانے میں چلا گیا۔ بیوی بھی اُس کے ساتھ ہی چلی آئی۔ اُس نے اُس کے چہرے کی کیفیت گھر میں داخل ہوتے ہی بھانپ لی تھی۔ لیکن اُس نے کچھ کہا نہیں۔ وہ خود ڈر رہا تھا۔ وہ چپ چاپ روٹی کھانے لگا۔ اُس کی بیوی نے بھی کوئی بات نہیں کہی چپ چاپ پنکھا جھلتی رہی۔ کبھی کبھار پوچھ لیتی "روٹی دوں؟......... رائتہ لیجیے گا؟"

روٹی کھانے کے بعد وہ حقہ لے کر برآمدے میں جا بیٹھا۔ جب اُس کی بیوی آئی تو اُس نے برآمدے کی بتی بجھا دی تاکہ باہر سڑک پر آنے جانے والوں کی نظر ادھر نہ پڑے۔ اُس کی بیوی چپ چاپ دروازے کی چوکھٹ میں بیٹھ گئی۔

اُسے پہلے کے دن یاد آگئے جب وہ اپنی بیوی کو کبھی آرام سے نہ بیٹھنے دیتا تھا۔ کبھی اُس کی چوٹی کھینچتا، کبھی ران پر چٹکی لیتا۔ کبھی اُسے چھاتی سے لگا کر بھینچ لیتا۔ لیکن ازدواجی زندگی میں سب سے راحت انگیز دَور وہی ہوتا ہے جب پہلا طوفان کم ہو جاتا ہے۔ بعد میں میاں بیوی میں نہ وہ جوش رہتا ہے نہ وہ گرمی۔ نہ جسم آگ کی طرح جلتا ہے۔ نہ دل مچلتا ہے۔ پھر دونوں میں ایک راحت انگیز سمجھوتہ اور روح پرور یگانگی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پچھلی شرارتوں پر لعنت ملامت کرتے ہیں۔ کچھ جھینپتے ہیں کچھ لطف اندوز ہوتے ہیں۔

اِس دَورِ زندگی کے بعد وہ آزمائے ہوئے دوستوں کی طرح ایک دوسرے کی محبت اور اعتماد میں زندگی کی نہایت پُرامن اور سرور انگیز گھڑیاں گزارنے لگتے ہیں۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ان گھڑیوں کے سامنے زندگی کے پہلے طوفانی اور ہنگامہ خیز لمحے کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ آخری دَور کو پہلا دَور ہی جنم دے سکتا ہے۔

جب وہ حقہ گڑگڑا رہا تھا اور اُس کی بیوی سڑک سے پرے تاریکی میں چند چلتے پھرتے سایوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُن کے دل ایک ہی تال پر دھڑک رہے تھے۔ رام لبھایا نے اپنی ہمت استوار کرنے کے لئے خوب گہرا کش لیا اور کھانس کر بولا:۔

"وہ آئی تھیں ؟"

"جی ہاں"

وہ چپ ہو گیا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ وہ خود ہی باقی بات کہہ دے لیکن اس کی بیوی بھی شاید اسی بات پر تلی ہوئی تھی کہ اگر وہ کچھ پوچھے تو وہ جواب دے۔ وہ پھر حقہ گڑگڑانے لگا۔ یہ خاموشی بڑی اذیت رساں محسوس ہونے لگی اس نے پھر کمرِ ہمت باندھی "تو پھر کیا ہوا ؟"

"کچھ نہیں"

اس نے سوالیہ نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا۔ لیکن اس کا دھیان دوسری طرف تھا۔ کہنے لگی "لڑکی کو دیکھ لیا ہے انھوں نے ہیں بڑے خاطر تواضع بھی کر دی تھی۔ لیکن کچھ امید نہیں"

"کیوں امید کیوں نہیں ؟"

وہ چپ رہی۔

"بھئی جب لڑکی میں کوئی عیب نہیں اور پھر تم نے ان کی خاطر بھی اچھی طرح کر دی تو اور کیا چاہیئے۔ تم بھی بڑی وہمی ہو۔ کیا انھوں نے انکار کر دیا ؟ بولو، کہو نا۔ کیا انھوں نے تم سے کچھ کہہ دیا ؟"

"آپ بھی عجیب باتیں کرتے ہیں۔ دوسرا کچھ کہے تب ہی انسان کو پتہ چل سکتا ہے۔ ان کی صورت ہی سے دل کا حال ظاہر تھا"

اس بات پر رام لبھایا گرم ہو گیا "صورت سے ظاہر ہو گیا تو جائیں بھاڑ میں .... ہماری بیٹی کسی اور کے پلے بندھ جائے گی۔ آخر ہمیں فکر بھی کیوں ہو۔ جب ہماری بیٹی بے داغ، نیک چلن اور سگھڑ ہے تو پھر میں تو یہی کہوں گا اسے لڑکوں کی کچھ کمی نہیں۔ ایسی لڑکی ملتی بھی ہے کہیں ؟"

"آپ تو پھر وہی باتیں کرتے ہیں۔ کتنی مرتبہ تو لوگ دیکھ گئے ہیں آخر بتاؤ کسی نے ہاں بھی کہی ؟"

اب اُس کے چپ رہنے کی باری تھی۔ وہ جلدی جلدی حقے کے چھوٹے چھوٹے کش لینے لگا۔ اور بڑی تیزی کے ساتھ وہ کچھ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یہ کام یوں نہیں ہوا کرتے"

اُس نے حقے کی نے پرے ہٹا کر تعجب سے پوچھا "اچھا تو اور کیسے ہوا کرتے ہیں میری کنو ؟"

"چلئے بس آگئے اپنی باتوں پر..... ہائے کب سوچو گے تم۔ لڑکی کو دیکھ کر تمھیں ڈر نہیں لگتا۔ اور پھر اوپر سے زمانہ جانتے ہو کون سا جا رہا ہے وہ تو کہئے ہماری بیٹی ہے ہی گئو۔ ادر لڑکیوں کو دیکھو کیسی بے شرم ہیں۔ آنکھیں پیشانی پہ جڑی ہوئی۔"

اب اُس کی بیوی خفا ہو رہی تھی۔ کیونکہ جب وہ اُسے تم کہہ کر مخاطب ہوتی تھی تو وہ سمجھ جاتا تھا کہ اب خیر نہیں۔ اب اُس نے نرمی اختیار کی "بھئی دیکھو نا! تم خود بہت سیانی ہو۔ میں تو پرماتما کا ہزار ہزار شکر ادا کرتا ہوں کہ میرے پلّے تم بندھیں۔ اب تم نہ مانو۔۔۔ تم ایسی بھاگوان عورت کے قابل ہی کہاں ہوں میں....."

اُس کی بیوی اُس کے الفاظ کی حقیقت کو خوب سمجھتی تھی۔ لیکن وہ اس ابلتی دال کی طرح جس پر ٹھنڈے پانی کے چار چھینٹے دے دیئے گئے ہوں فوراً نیچے بیٹھ جاتی تھی۔

رام بھایا مسکرایا "اب تم جو کہو وہی کروں۔ تم مجھ پہ خفا ہوتی ہو

اب کہہ دو بھگوان کو سامنے جان کر کبھی میں نے تمھیں کوئی بڑی بھلی بات بھی کہی۔ کبھی تمھارا ہاتھ بھی روکا میں نے.....؟"

"میں نے یہ کب کہا" اُس کی بیوی کی آواز میں کچھ رقت سی پیدا ہو گئی "آپ بس میرا ہاتھ بٹائیے نا، باقی میں کرلوں گی سب کچھ۔"

"ہاں ہاں بھئی تمھارا ہاتھ بٹانا کوئی غیر کا ہاتھ بٹانا تو نہیں نا؟"

لیکن اس کے بعد جب اُس کی بیوی نے تجویز پیش کی تو وہ دم بخود رہ گیا۔ وہ تجویز یہ تھی:-

چند دنوں کے لئے کہیں سے مانگ کر اعلیٰ فرنیچر اور سجاوٹ کا سامان لایا جائے۔ چینی کے برتن ہوں، دو نوکر ہوں۔ اگر سامان مانگے سے نہ ملے تو کرایہ پر لایا جائے۔ اور پھر دروازے پر ایک بھینس اور ایک گائے بندھی ہوئی ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

بیوی نے اس بات پر زور دیا کہ ظاہر اسٹیپ ٹاپ بھی تو ہونی چاہئے۔ آخر اسی ترکیب پر عمل کیا گیا۔ ایک مہینے کے لئے کرایہ پر بہت اعلیٰ فرنیچر، دریاں، چینی کے برتن۔ دو نوکر بھی رکھ لئے گئے۔ دیہات سے ایک رشتہ دار کی ایک بہت اعلیٰ بھینس لاکر دروازے پر باندھ دی گئی۔ بچوں کو ہر وقت نئے کپڑوں میں لپیٹے رکھا۔ بچے بچارے حیران کہ آخر یہ کیا سے کیا ہو گیا۔

یہ ترکیب کام کر گئی۔ اب جو لوگ لڑکی کو دیکھنے کے لئے آئے۔ اُنھوں نے لڑکی کو بھی دیکھا بھالا۔ لیکن لڑکی سے زیادہ اُن کی نگاہیں ساز و سامان پر پڑتی رہیں...... اور اُن کو لڑکی بہت پسند آئی۔ اِدھر اُدھر کی ضروری اور غیر ضروری بات چیت کے بعد شادی کا دن بھی مقرر ہو گیا۔

ایک روز جبکہ اُس کے گھر پر" ویلکم" کے تختے لگائے جا رہے تھے کیلے کے درختوں کے بڑے بڑے دروازے بنائے جا رہے تھے۔ رنگ برنگ کے کاغذوں کی جھنڈیاں رسیوں سے چپکا کر اُنھیں اِدھر اُدھر باندھا جا رہا تھا۔ اُس نے ایک جگہ سے تین ہزار روپیہ قرض لیا۔ گھر آکر جب اُس نے روپے بیوی کے حوالے کر دیئے تو اُس کا دل بیٹھ گیا۔ گھر کی ساری پونجی کے ساتھ تین ہزار روپیہ قرض۔ یہ شادی ہو جائے گی وہ سرخرو ہو جائیں گے۔ لڑکی اپنے گھر میں جا بسے گی ..... اور اگر وہ اپنے ساتھ اچھا جہیز، گہنے اور نقدی لے کر جائے گی تو غیروں کے گھر میں بھاگوان کہلائے گی، ورنہ .... اِدھر وہ کولھو کے بیل کی طرح تھکے ماندے قدموں سے آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ اور یہ قرضے کا بوجھ اُس کے سینے پر دن بدن زیادہ ہوتا جائے گا۔

اُس رات اُسے نیند نہ آئی۔ بُرے بُرے خواب آتے رہے۔ اُس نے جو ساری عمر اس قدر محنت کی تھی کیا اس کا یہی نتیجہ تھا؟ اسے نہیں معلوم کہ وہ کب سویا۔ سویا کیا بیہوش ہو گیا۔

جب صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ اُس کی بڑی بیٹی کو بخار ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر کو بُلایا گیا۔ دوا پلائی گئی۔ تیمارداری ہونے لگی۔ شادی میں زیادہ دن نہ رہ گئے تھے۔ اِس لئے اُن کی یہی کوشش تھی کہ وہ جلد از جلد اچھی ہو جائے۔

لیکن بخار دن بدن بڑھتا چلا گیا۔ پہلے تو کچھ پتہ ہی نہ چلا کہ یہ بخار کون سا تھا۔ لیکن بالآخر ڈاکٹر نے کہا کہ میعادی بخار ہو گیا ہے اور اِس کا کوئی علاج نہیں۔ تیمارداری کئے جاؤ —— تیمارداری کی گئی

دن رات والدین بیٹی کے سرہانے سے لگے بیٹھے رہتے ..... لیکن وہ جانبر نہ ہو سکی۔

سب لوگ اُس کی موت پر انتہائی افسوس کا اظہار کر رہے تھے کیسی بے وقت کی موت تھی۔ چڑھتی جوانی میں جب کہ اُس کے ہاتھ مہندی سے رنگے جا رہے تھے یم راج نے اُسے آن دبوچا۔ پرماتما کے کاموں میں واقعی انسان کو کچھ دخل نہیں۔

اُنھوں نے اپنی لاڈلی گنّو بیٹیا کو دوسری ہی پالکی پر بٹھایا اور شمشان کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ وہ ہرا بھرا جسم جسے پینچ پینچ کر اُنھوں نے اس قدر بڑا کیا تھا لکڑیوں پر رکھ کر اُسے آگ دکھادی۔

جب شعلے سرد ہو گئے وہ لوگ واپس گھر کو لوٹ آئے۔ شادی کے ہنگامے موت کے نوحوں میں تبدیل ہو گئے۔ وہ رات کس قدر بوجھل اور تاریک تھی۔

رام لبھایا برآمدے میں اپنی سرکنڈے کی کرسی پر حسبِ معمول ٹانگیں سمیٹے بیٹھا تھا۔ حقہ قریب ہی پڑا تھا۔ لیکن اُس کی چلم ٹھنڈی پڑی تھی۔ پہلے وہ اپنی بیٹی کو آواز دے کر چلم بھروا لیا کرتا تھا۔ وہ کھوئی کھوئی نظروں سے خلا میں گھور رہا تھا۔ آخر یہ بیچاری اتنی بڑی کیوں ہوئی کیوں ایسی جوان ہوئی۔ کیوں نہ بچپن ہی میں مر گئی۔ جیسے اُس کے اور بھائی اور بہنیں مر گئی تھیں۔ وہ اُس وقت پیدا ہوئی جب وہ جوان تھا جب وہ مسٹر رام لبھایا تھا۔ اُس وقت تو وہ اُن کے لئے ایک ننھا سا کھلونا تھی۔ لڑکیوں کی اتنی پروا ہی کہاں کی جاتی ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ چُپ رہی۔ اُس نے کبھی کسی شے کے لئے ضد نہیں کی۔ جب

بچی ہی تھی تب بھی وہ کسی کو دق نہ کرتی تھی۔ بھوکی ہو یا پیاسی آرام سے اپنے لوہے کے پنگوڑے میں لیٹی مسکرایا کرتی۔ اور وہ لوہے کا پنگوڑا اب تک گھر میں موجود تھا۔ اس کے بعد وہ پنگوڑا اُس کے بھائی بہنوں کے کام آتا رہا۔

بچاری جوان ہوئی تو اُس نے کبھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھا دروازے یا کھڑکی میں سے تاک جھانک نہیں کی۔ اپنے والدین اور بزرگوں کا پورا لحاظ اور ادب کیا۔ بچپن میں سر اٹھا کر نہ چلی اور جب سے جوان ہوئی نظر اُٹھانا اُسے بار ہو گیا۔

آخر اُس پر بھی تو اسی طرح جوبن آیا تھا جیسے اور لڑکیوں پر آتا ہے۔ اُس کا دل بھی تو محبت کے لئے اسی طرح تڑپتا ہوگا جیسے اور لڑکیوں کا۔ وہ بھی تو نسوانیت سے مجبور ہو کر چاہے جانے کی تمنا کرتی ہو گی۔ لیکن اُس نے ماں باپ کی آبرو کا خیال رکھا۔ اور جبکہ اُس کے والدین اپنا آخری فرض پورا کرنے والے تھے وہ چل بسی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پرلوک کو چل دی۔ رام لبھایا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

دماغ ہلکا ہونے کے بعد اس کے دل کے ایک گوشے سے اطمینان اور شادمانی کی ایک ننھی سی شعاع بلند ہوئی اور وہ بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اُس نے اُسے اچھی طرح پہچان لیا، سمجھ لیا، محسوس کر لیا۔ اُس نے ایک جھرجھری سی لی.........اب اُس پر کوئی بوجھ نہ تھا۔ اُس کی پونجی بچ گئی تھی، وہ تین ہزار روپیہ فوراً واپس کر دے گا وہ تباہ نہ ہوگا۔

دفعتاً اُس کا دل زور سے دھڑک گیا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اور چوروں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

کاغذ کی جھنڈیاں خاک میں مل گئی تھیں، خوش آمدید کے تختے اُلٹ گئے تھے۔ کیلوں کے درختوں کے دروازے ایک طرف گرے پڑے تھے۔ ہر شے اُداس، خاموش، بے حس، بے کیف۔

آزاد فاقہ

۱۹۳۹ء میں جب کہ دوسری جنگِ عظیم کا آغاز ہوا میں روزگار کی تلاش میں آوارہ پھرا کرتا تھا۔ جنگِ عظیم شروع ہو جانے کے بعد تو روزگار کی کچھ کمی ہی نہ رہی۔ لیکن میں نے انھیں دنوں بلیو بلیک روشنائی بنانے کا کام شروع کر دیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے یہ کام پندرہ روپئے کے سرمایہ سے شروع کیا تھا۔ جس بازار میں ہم رہتے تھے وہ شہر کا بہت اہم بازار نہیں تھا۔ لیکن میرے کام کے لئے یہ جگہ بُری نہیں تھی۔

پہلے پہل اس کام میں کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تھی۔ اکیلا کام کرنے والا تھا۔ خود ہی روشنائی تیار کرتا۔ خود ہی شیشوں میں بھر کر ڈبوں میں بند کرتا اور پھر خود ہی دوکانداروں کے پاس انھیں بیچنے کے لئے جاتا۔ لیکن ان دنوں ہندوستان کی بنی ہوئی سیاہیوں کو پوچھتا ہی کون تھا۔ لیکن جب جنگ کی وجہ سے باہر کا بنا ہوا مال آنا

ناممکن ہوگیا تو پھر دیسی چیزیں بھی مارکیٹ میں کھپنے لگیں ۔
ہاتھ بٹانے کے لئے میں نے دو نوکر بھی رکھ لئے ۔ گھر کی حالت بھی سدھر گئی ۔ اگرچہ ایک طرف گرانی کی وجہ سے گھر کے اخراجات بہت بڑھ گئے تھے ۔ لیکن دوسری جانب آمدنی بھی امید سے بڑھ چڑھ کر ہو رہی تھی ۔

شام کے وقت گلی محلہ کے لوگ بھی میری دوکان پر وقت گزارنے کے لئے آن بیٹھتے تھے اِن میں دفتروں کے وہ بابو بھی تھے جنھیں پہلے میں رشک کی نظروں سے دیکھا کرتا تھا ۔ خود میں نے اُن سے کئی مرتبہ کہا تھا کہ بھئی مجھے بھی کوئی چھوٹی موٹی نوکری دلوا دو ۔ لیکن اب وہ مجھے رشک کی نظروں سے دیکھتے تھے ۔ رفتہ رفتہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں اُن کی نسبت زیادہ آرام سے ہوں ۔ وہ مجھے حقیر مخلوق نظر آنے لگے ۔

میرا کاروبار اب ترقی کی راہ پر گامزن تھا ۔ میں نے دو تین مرتبہ وقت نکال کر اِدھر اُدھر کے شہروں کا چکر لگالیا اور مجھے معلوم ہوا کہ اگر باقاعدہ گھوم پھر کر یہ کام کیا جائے تو اچھا خاصہ روپیہ کمایا جا سکتا ہے ۔

چنانچہ ایک روز شام کے وقت چند دوست حسب معمول میری دوکان میں جمع ہوئے تو میں نے اُنھیں بتایا کہ میں چاہتا ہوں کہ یہاں دفتر میں ایک پڑھا لکھا منیجر ملازم رکھ لوں جو وقتاً فوقتاً صوبے بھر کے شہروں میں گھوم پھر کر آرڈر بھی لایا کرے ۔

میرے دوستوں نے یہ بات سنی تو حیران رہ گئے تعجب اُن کے

چہروں سے صاف عیاں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ میں خاصے روپئے کما رہا ہوں۔ لیکن خواب میں بھی اُن کا خیال یہ نہ تھا کہ میں اس قابل بھی ہو گیا ہوں کہ ایک منیجر بھی ملازم رکھ سکتا ہوں۔

اُنھوں نے مشورہ دیا کہ اخبار میں اس مطلب کا اشتہار نکلوا دوں اس طرح کئی اشخاص درخواستیں دیں گے۔ اور پھر اُن میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لینا مشکل نہ ہو گا۔

مجھے یہ تجویز معقول معلوم ہوئی۔ چنانچہ اخبار میں اشتہار دے دیا گیا خلافِ امید ڈیڑھ سو سے اوپر درخواستیں آئیں۔ اُس رات میں بیوی کے ساتھ بیٹھا درخواستیں پڑھتا رہا۔ بیوی مجھے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ پہلے میں خود درخواستیں بھیج کر بیٹھا جواب کا انتظار کیا کرتا تھا۔ آج ڈیڑھ سو سے اوپر نوجوان میری توجہ کے منتظر تھے۔ ہمارے گھر میں یہ ایک بالکل ہی نئی بات تھی۔

درخواستوں پر غور کرنے کے بعد میں نے سولہ امیدواروں کو انٹرویو کے لئے بُلایا۔

انٹرویو سے ایک روز پہلے میں خود پریشان ہو رہا تھا۔ جیسے خود میرا انٹرویو ہونے والا ہو۔ گھر کے سبھی لوگ یعنی بوڑھا باپ، ماں، بیوی، بہنیں کرسیوں اور چارپائیوں پر بیٹھی اپنی اپنی قیمتی رائے کا اظہار کر رہی تھیں۔ خاندان کا ہر فرد اپنی اہمیت کو محسوس کر رہا تھا۔ میں بظاہر بڑی سنجیدگی سے ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔ جیسے یہ سب میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو۔ گھر والوں کو بھی مجھ پر پورا بھروسہ تھا۔ اخبار میں اشتہار دینے کی ترکیب سنتے ہی سب میرے نام کا کلمہ پڑھنے لگے تھے۔

لیکن میرے دل میں ایک طوفان سا اُمڈ رہا تھا۔ اُمیدواروں میں مجھ سے کہیں زیادہ پڑھے لکھے اور تجربہ کار اشخاص تھے۔ میں اسی فکر میں گھلا جا رہا تھا کہ میں ان سے کیونکر گفتگو کروں گا۔ کیا کیا سوالات دریافت کروں گا اور جب وہ جواب دیں گے تو میں کیونکر اپنے سر کو ایک خاص انداز سے حرکت دوں گا۔ جیسے سب کچھ سمجھتا ہوں اور پرانا گھاگ ہوں۔

گئی رات تک میں اسی قسم کی باتیں سوچتا رہا اور مجھے کچھ علم نہیں کہ کب میری آنکھ لگ گئی۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ گھر کے اور سب لوگ کبھی کے سو چکے تھے۔

صبح ہی صبح آنکھ کھلی۔ داتون کرتا ہوا نیچے گیا۔ دفتر کی صفائی کروائی۔ ہر شے قرینے سے رکھی۔ میز پر دھوبی کی دُھلی ہوئی چادر بچھا دی۔ قلمدان، مہریں، پن کُشن وغیرہ۔ ہر چیز جھاڑ پونچھ کر مناسب جگہ پر رکھ دی گئی۔ کیلنڈر کی تاریخ بدل کر لگا دی۔

ان انتظامات کے بعد اوپر گھر میں پہنچ کر خوب اچھی طرح ڈاڑھی بنائی بال سنوارے، اچھے کپڑے پہنے اور ناشتہ کیا۔ جب اُمیدواروں کے آنے کا وقت ہوا تو میں دفتر میں جا بیٹھا۔ نوکر کو ہدایت کر دی کہ جو کوئی آئے اُسے برآمدے میں پڑی ہوئی بنچوں پر بٹھا دے۔

بڑی میز کے آگے بیٹھا بیٹھا میں ریہرسل کرنے لگا۔ جب امیدوار کمرے میں داخل ہوگا۔ تو وہ مجھے خوب جھک کر یا بڑے ادب کے ساتھ سلام کرے گا۔ اور میز کے سامنے اُس وقت تک کھڑا رہے گا جب تک کہ میں اُسے بیٹھنے کا اشارہ نہ کروں۔ لیکن میں بہت جلد ہی اُسے بیٹھنے کا اشارہ کر دوں گا۔ وہ بیٹھ جائے گا۔ تو میں پوچھوں گا مسـ

"ہم..... تو آپ کا نام..... ہے؟"

"جی بندہ پرور۔"

"ہم...... اونہہ...... اونہوں..."

میں بہت کم بولوں گا۔ ہر لفظ بڑے رعب سے ادا کروں گا۔ ازحد سنجیدہ بنا رہوں گا۔ خواہ امیدوار کیسے بھی دانت نکالے۔ میں زیادہ سے زیادہ اپنے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پیدا ہونے دوں گا۔ پھر میں انھیں کام کی نوعیت بتاؤں گا۔ اور یہ کہنے میں بھی کچھ ہرج نہ ہوگا کہ میں وقت کا بہت پابند ہوں اور اسی قسم کے ملازموں کو پسند کرتا ہوں۔

تھوڑی دیر بعد امیدوار آنے شروع ہو گئے۔ میں دروازے کے قریب کھڑا چھپ کر ہر آنے والے کو دیکھ رہا تھا..... پھر میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے ایک امیدوار کو اندر بلایا۔

ایک ہی امیدوار سے نپٹنے کے بعد میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ جو بچارے ملازمت کے لئے آتے ہیں وہ خود ہی پریشان ہوتے ہیں۔ اُن کے اپنے دل دھڑکتے ہوتے ہیں۔ بھلا وہ بچارے مجھ پر کیا رُعب جمائیں گے۔

میرا خیال ہے کہ آٹھواں شخص جو میرے کمرے میں داخل ہوا مظفر تھا۔

مظفر کا قد کچھ نکلتا ہوا تھا۔ اکہرا بدن۔ آنکھوں پر چشمہ۔ سر کے بال برش سے پیچھے کی طرف ہٹے ہوئے مانگ ندارد۔ پتلے حساس ہونٹ۔ ناک ذرا خم کھائی ہوئی۔ تیز چمکیلی آنکھیں۔ وہ کمرے میں یونہی

بے تکلفی سے داخل ہوا۔ اپنے ہیٹ کو چھو کر اُس نے سر کو ذرا سا خم دیا۔ اور بیشتر اِس کے کہ میرا ہاتھ بیٹھنے کا اشارہ کرنے کے لئے مکمل طور پہ اوپر اُٹھے وہ "تھینک یو" کہہ کر بیٹھ گیا۔

مجھے اس کا انداز پسند نہیں آیا۔ میں نہیں جانتا میرے چہرے سے کس قسم کے جذبات کا اظہار ہو رہا تھا۔ اُس نے کہا:۔

"آپ کو منیجر چاہیئے نا! جی تو میں اپنی خدمات پیش کرتا ہوں"! ....آپ نے اشتہار میں کوئی تفصیل نہیں دی۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ آپ سپاہیوں کا کام کرتے ہیں۔ اور میری رائے میں دورانِ جنگ میں یہ بہت منافع بخش کام ثابت ہوگا...... ایک بات اور عرض کروں...... ہندوستان میں کچھ لوگ نئے قسم کے کام شروع کریں گے۔ لیکن سب کی ذہنیت یہی ہوگی کہ پبلک کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے وہ زیادہ سے زیادہ روپیہ کمائیں...... لیکن آپ محتاط رہیئے گا۔ اگر آپ نے اپنا کام ایمانداری اور اعلیٰ پیمانے پہ جاری رکھا تو یقین فرمائیے جنگ ختم ہو جانے کے بعد بھی آپ اپنا کام جاری رکھ سکیں گے......"

اُس نے مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا۔ چونکہ اُس نے اتنی باتیں کہہ دی تھیں۔ مجھے بھی ہوں ہاں کر کے کچھ نہ کچھ جواب دینا ہی پڑا۔

اُس نے ہیٹ اُتار کر میز پہ رکھ دیا۔ اتنی دیر تک ہیٹ اُتار دینے کی اُس نے ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ پھر اُس نے جیب میں سے سگریٹ کیس نکالا اور ایک سگریٹ مجھے دکھا کر کہنے لگا "اجازت ہے"؟

اور پیشتر اس کے کہ میرے منہ سے کوئی لفظ نکلے۔ اُس نے سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر دیا سلائی جلائی۔

مجھے اُس کی بیہودگی پر غصہ آرہا تھا۔ لیکن اُس کے چہرے پر غرور یا شرارت کا شائبہ تک نہ تھا۔ بلکہ وہ اِس طرح گفتگو کر رہا تھا۔ جیسے ایک انسان کو کسی انسان سے کرنی چاہیئے۔ اور مجھے اُس کا اِس طرح آزاد اور بے تکلف ہونا بھی پسند نہ تھا۔

اُس نے دھواں اُڑاتے ہوئے کہا "آپ اِس کام کو بڑھائیے"

"جی ہاں" میں نے جواب دیا "اسی ضرورت سے یہ اشتہار شایع کیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی ایسا شخص ہو جو یہاں کام سنبھال سکے۔ اور باہر کے شہروں کا دورہ بھی کرلے۔ اِس طرح ترقی کی زیادہ امید ہے۔"

میں نے یہ باتیں ایسے لہجہ اور ادا میں کہہ ڈالیں جیسے میں اس میدان کا کوئی پُرانا کھلاڑی ہوں۔ وہ اِس دَوران میں کُرسی کے پیچھے کی طرف جھکا ہوا سر اس طرح ہلاتا رہا جیسے میں اُس کے سامنے ایک طفلِ مکتب ہوں۔

میری مکمل گفتگو سن لینے کے بعد اُس نے سگریٹ کا گل جھاڑتے ہوئے کہا۔" دیکھئے اگر آپ مجرانہ باتیں تو عرض کروں کہ میں یہ دَورے دَورے پر جانا پسند نہیں کرتا۔ وجہ یہ کہ میں، جیسا آپ دیکھ رہے ہیں ذرا کمزور سا آدمی ہوں مجھ سے یہ جھنجھٹ تو ہرگز نہ ہوگا......"

مجھے اس کی یہ بات بہت عجیب معلوم ہوئی۔ بھلا اِس بھلے آدمی سے کوئی پوچھے کہ میں نے تمھیں منیجر بنایا کب ہے جو ابھی سے حیل وحجت

شروع کر دی۔ میں اُس کی اس بات کا کوئی چُست سا جواب دینا
چاہتا تھا لیکن جلدی میں کچھ نہ سُوجھا۔

اُس نے بڑے اطمینان سے کش کھینچتے ہوئے کہنا شروع کیا۔
"میری ناچیز رائے میں آپ کو اس وقت بہت ہی پھونک پھونک
کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے .... آپ دو تین ایجنٹ رکھ لیجئے
مختلف علاقے اُن کے سپرد کر دیجئے۔ اس میں فکر کی کوئی بات نہیں
اِن ایجنٹوں کے اخراجات نکال کر بھی آپ کو معقول منافع ہوگا ——
پھر اُس نے اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اِس کرسی پر جس
پر کہ اس وقت آپ بیٹھے ہوئے ہیں آپ کا ایک سمجھدار اور تجربہ کار
منیجر بیٹھا ہونا چاہیئے۔ جو کوئی یہاں آئے اچھا اثر لے کر جائے ....
.... اور جناب لاہور کوئی معمولی شہر نہیں۔ آپ اِس شہر کے اندر اپنے
کاروبار کو اور زیادہ آرگنائز کیجئے۔ سرکاری ٹھیکوں کے لئے کوشش
کیجئے۔ پرائیویٹ فرموں سے تعلقات پیدا کیجئے۔ اسکولوں اور کالجوں
کے دفتروں میں اپنی سیاہی پہنچائیے۔ ہر اچھے دُکاندار کو اپنی روشنائی
کا ایک بڑا سا بورڈ مفت دیجئے اور بیسیوں گُر ہیں بزنس (تجارت)
کے ...... درحقیقت آپ کو ایسے ہی منیجر کی ضرورت ہے جو نہ صرف
اچھی بات چیت کے فن سے واقف ہو۔ بلکہ وہ گاہکوں کو اپنی چیز کی
برتری کا یقین دلا سکے۔ بس یہی ایک شے ہے۔ اگر گاہک آپ پہ
ایمان لے آئے تو بس چاندی ہی چاندی ہے۔ لیکن ایک بات یاد
رہے کہ کبھی دل میں گاہک کو بے وقوف بنانے کا خیال نہ آئے۔
میری بات سمجھے نا آپ ! .... بزنس میں وہ ہے جو اُڑتی چڑیا کو

پہچان لے۔"

یہ آخری فقرہ نہ معلوم اس نے کیوں کہا۔ میں اُسے اپنے آپ سے منسوب کر کے کچھ مرعوب سا ہو گیا۔

"بہتر" اُس نے سگریٹ پرے پھینک کر کہا "اب میرے خیال میں دیگر ضروری باتیں بھی ہو جانی چاہئیں .... اچھا تو ..."

"میں شاید پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مجھے ایسے منیجر کی ضرورت ہے جو دورہ بھی کر سکے اور یہاں کا کام بھی بھگتا سکے۔ اِس صورت میں اَسّی ۸۰ روپئے ماہوار سے دونگا۔"

اُس نے ہیٹ ہاتھ میں تھام کر جواب دیا "آپ میری گزارشات پر غور کر لیجئے .... میری ناچیز رائے میں آپ کو اسی قسم کے منیجر کی ضرورت ہے جو مستقل طور پر یہاں رہ کر اس کام کو ترقی دے سکے۔ فی الحال میں سَو روپیہ ماہوار لے لوں گا .... اور پھر اُس میں چار یا پانچ ماہ بعد کم از کم پچاس روپیہ کا اضافہ ہو جانا چاہئے .... میں کل صبح خود ہی حاضرِ خدمت ہو جاؤں گا، آپ غور کر لیں۔"

میں سارا دن اور ساری رات اِس بات پر غور کرتا رہا۔ اور دوسرے دن جب وہ آیا تو میں نے اُسے ملازم رکھ لیا۔

اُس نے آتے ہی دفتر کا حلیہ بدل دینے کے لئے کہا۔ چنانچہ ہم دونوں بازار میں گئے۔ کچھ اچھی قسم کا فرنیچر اور دری چٹائی وغیرہ خرید لائے اور اُسی دن اُس نے دفتر کی صورت بدل دی۔ واقعی اب دفتر خوبصورت دکھائی دینے لگا۔ اُس نے بڑی میز سے ذرا پرے کھڑے

ہوکر کہا "نائیس (Nice)۔ اب یہ انسانوں کے بیٹھنے کی جگہ ہوگئی ہے۔
اُس کی اس قسم کی باتیں دل میں نشتر کی طرح اُتر جاتی تھیں۔ میں جب اُس کے چہرے کی طرف دیکھتا تو وہ از حد سنجیدہ اور متین نظر آتا تھا۔
دوسرے روز جب میں دس بجے کے قریب اوپر سے نیچے دفتر کی طرف گیا تو دیکھا کہ مظفر کرسی پہ بیٹھا کام میں مصروف ہے۔ اس وقت وہ چند نئے رجسٹروں میں پنسل سے لکیریں لگا رہا تھا۔ میں جب اندر داخل ہوا تو اُس نے بلا میری طرف دیکھے کہا "آداب عرض جناب!"
مجھے تعجب ہوا کہ اُس نے بلا دیکھے مجھے کیسے پہچان لیا۔
اُس نے مسکرا کر کہا "میں آپ کے قدموں کی چاپ ہی سے آپ کو پہچان سکتا ہوں۔ اگر آپ دس آدمیوں کے ساتھ اپنی عام چال کے مطابق گھوم رہے ہوں تو بھی مجھے آپ کی چال پہچان لینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔"
میں دل ہی دل میں ہنسا۔ سوچا یہ کوئی شرلک ہومز کا چچا معلوم ہوتا ہے۔
میں چپ چاپ میز کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اُس نے میرے لئے میز کی خاص کرسی خالی نہیں کی۔ ہاتھ سے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا:۔
"تشریف رکھیے نا۔"
پھر اُس نے سگریٹ سلگا لیا۔
"دیکھئے یہ لیبل جو آپ نے چھپوائے ہیں بہت بھدے ہیں۔ اور یہ ڈبے بھی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر اتنے رنگوں میں لیبل چھپوانے کا

آپ کو مشورہ بس بے وقوف نے دیا تھا۔"

وہ لیبل دراصل میری ہی تجویز کے مطابق چھپے ہوئے تھے۔ اُس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"اس قسم کے لیبل چھپوانا اور اُنھیں شیشیوں اور بوتلوں پر لگانا بڑی بدذوقی کا ثبوت دیتا ہے...... ایک رنگ صرف ایک رنگ کافی ہے...... آپ سمجھے...... اور پھر حروف بھی سادہ ہونے چاہئیں۔ زیادہ ڈیکوریشن کی ضرورت نہیں ہے...... دیکھئے میری تجویز یہ ہے۔ اس جگہ روشنائی کا نام بس اتنے بڑے بڑے حروف میں لکھا ہوا ہو۔ نیچے باریک حروف میں اس کی تعریف میں ایک اچھا سا جملہ بس۔ اِدھر بھی ایک موٹی سی لکیر ہو اور اس طرف بھی..."

اُس نے اپنی مرضی کے مطابق کسی آرٹسٹ سے ڈرائنگ بنوالی۔ اور پھر اُس کا بلاک بنوالیا۔

اُس کے جسم میں خون کی کمی معلوم ہوتی تھی۔ جسم کمزور۔ آنکھوں کے نیچے گڑھے۔ ہونٹ یونہی پھیکے سے۔ چہرہ زردی مائل۔ لیکن وہ غضب کا پھرتیلا شخص تھا۔ اُس اکیلے شخص کی چلت پھرت سے دفتر میں رونق سی رہتی تھی۔

اُس کی تجویز کے مطابق دو ایجنٹ بھی رکھ لئے گئے۔ ایک کو باہر بھیج دیا گیا۔ ایک لوکل کام کے لئے رکھ لیا گیا۔

وہ یقیناً بڑا چلتا پرزہ شخص تھا۔ چند ہی دنوں کے اندر اُس نے سب لوگوں سے واقفیت پیدا کر لی۔ اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر، کالجوں کے پرنسپل، دیسی و انگریزی فرموں کے منیجر بھی سبھی اُس کے دوست بن گئے۔

ایک روز میں برآمدے میں کھڑا ہوا تھا کہ ایک انگریز وہاں آیا۔ کہنے لگا میں منیجر سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں تو اُسے دیکھ کر ڈر ہی گیا۔ اور جب مظفر کمرے سے باہر آکر اُس سے بڑے تپاک کے ساتھ ملا تو میں حیران رہ گیا۔ وہ اُسے دفتر میں لے گیا۔ وہاں وہ دونوں کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اب پہلے کی لنسبت کہیں بہتر کام ہو رہا تھا۔ بلکہ کہنا چاہئے کہ مظفر نے میرے کاروبار کی کایا پلٹ دی۔ اب کام ایسے پیمانے پر چل رہا تھا کہ میں خواب میں بھی اس کا خیال دل میں نہ لا سکتا تھا۔ مظفر اِس قدر محنتی شخص تھا کہ شاید میں خود بھی اتنا کام کبھی نہ کر سکتا تھا۔ اور وہ یہ کام اِس طرح کرتا تھا جیسے زندگی میں اُس کا نصب العین ہی یہی تھا کہ اُسے کامیاب بنا لے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں کچھ بے چین سا رہتا تھا۔

جب سے وہ آیا تھا میرے لئے کوئی کام ہی نہ رہ گیا تھا۔ سارا سارا دن بیٹھا مکھیاں مارا کرتا۔ میرا منیجر کبھی مجھ سے کسی قسم کا مشورہ طلب کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرتا تھا۔ بلکہ اگر میں کوئی صلاح دیتا بھی تو اگر وہ میرا زیادہ لحاظ کرتا تو چپ رہ جاتا ورنہ اُسے میری بات رد کر دینے میں بھی کچھ تکلف نہ تھا۔

میری بات رد کر دینے کے بعد فوراً کوئی ایسی تجویز پیش کر دیتا جو مجھ سے یقیناً کہیں بہتر ہوتی تھی۔ اِس لئے مجھے خاموش رہنا پڑتا تھا۔۔ ۔۔۔۔۔۔ یہاں تک کہ میں اُس کے سامنے کوئی تجویز پیش کرتا ہوا بھی ڈرنے لگا تھا۔

پہلے چند ماہ تو واقعی میں مرعوب رہا۔ مجھے اپنا بیکار بیٹھنا پسند نہ تھا۔ یہ درست ہے کہ جب میرا کام اچھا خاصہ چل رہا تھا تو پھر مجھے اس قدر بے چینی کا اظہار کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ میری الجھن کا سبب یہ تھا مجھے اُس نے اِس بات کا شدید طور پر احساس کرا دیا تھا کہ میں ایک نا اہل شخص ہوں۔ میری کوئی رائے اس قابل نہیں کہ اُس پر عمل کیا جا سکے۔

یہ بھی درست ہے کہ وہ محض باتیں نہیں بناتا تھا بلکہ جو کچھ کہتا تھا کر کے دکھا دیتا تھا...... لیکن مجھے اُس نے بالکل ہی نظر انداز کر دیا تھا۔ میں دفتر یا برآمدے میں یونہی بے کار کتے کی طرح گھوما کرتا تھا۔ اُس نے کبھی مجھے خوش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کہتا تھا۔ میں صرف آزادی کے ساتھ کام کر سکتا ہوں! مجھے ایک مرتبہ میرا فرض سمجھا دیا جائے اور ایک مرتبہ مجھے اپنے کام کی نوعیت معلوم ہو جائے تو بس پھر مجھے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ میں یہ بات پسند نہیں کرتا کہ جو کاٹھ کا اُلو اُٹھے میرے کام میں ٹانگ اڑا دے۔

اسی پر بس نہ تھی بلکہ اُس نے اپنی سہولت کے مطابق سارا ٹائم ٹیبل ہی بدل ڈالا تھا۔ میں نے صبح نو بجے سے لے کر شام کے چھ بجے تک دفتر کا وقت مقرر کیا تھا۔ دوپہر کو پون گھنٹے کا وقفہ کھانا کھانے کے لئے۔ لیکن اُس نے اسے بدل کر دس سے ساڑھے چار بجے تک کام کا وقت مقرر کر دیا تھا اور دوپہر کے وقت ڈیڑھ گھنٹے کا وقفہ۔ میں نے اُس کی ہر بات برداشت کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن یہ تو بس حد ہی ہو گئی۔ اس طرح دوسرے نوکروں پر بھی برا اثر پڑتا تھا۔ وہ

یونہی بڑبڑاتے رہتے تھے۔ میرے پاس آکر چغلیاں کھاتے تھے۔
میں نے ایجنٹ سے کہا کہ وہ کسی طرح مظفر کے کانوں تک یہ بات پہنچادے کہ میں اس بات کو پسند نہیں کرتا۔
جب ایجنٹ نے اُس سے یہ بات کہی تو اُس نے یہ جواب دیا کہ ان کی پرواہ مت کرو۔ اُنھیں اِن باتوں کی کچھ خبر ہی نہیں۔ جل لگا کر انسان جو کام ایک گھنٹہ میں بھگتا سکتا ہے وہی کام اگر بے دلی سے کیا جائے تو تین گھنٹے میں بھی ختم نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی بزنس کا ایک گُر ہے کہ نوکروں کو زیادہ سے زیادہ آرام اور تفریح کرنے کا موقع ملے۔ اِس طرح وہ زیادہ بہتر کام کر سکتے ہیں۔
اس کا یہ جواب معقول تھا۔ لیکن دوسرے نوکروں کے سامنے وہ مجھے عقل سے کورا ظاہر کرے یہ بات میری قوتِ برداشت سے باہر تھی۔
چنانچہ ایک روز دوپہر کے وقت وہ جب کھانا کھا کر واپس آیا تو میں نے ذرا بگڑ کر کہا:۔
"مسٹر مظفر! آپ نے دفتر کا وقت بالکل بدل ڈالا ہے۔۔۔"
"جی۔۔۔۔۔۔۔ دیکھئے صبح میں ذرا دیر سے جاگتا ہوں۔ شام کے وقت مجھے ٹینس کھیلنے کے لئے جانا ہوتا ہے۔ اگر مجھے چھ بجے تک اس جگہ بیٹھنا پڑے تو پھر میرا سارا پروگرام درہم برہم ہو جائے"
"اور پھر آپ دوپہر کو بھی پون گھنٹے کی بجائے ڈیڑھ گھنٹے کی چھٹی مناتے ہیں۔۔۔۔"
"خاں صاحب! میرے خیال میں آپ کو میرے کام پر نگاہ رکھنی

چاہیے.......پندرہ منٹ مجھے گھر جانے کے لئے درکار ہیں اور پندرہ منٹ واپس آنے کے لئے چاہئیں۔ آپ خود ہی بتائیے کہ پندرہ منٹ میں روٹی کیسے کھا سکتا ہوں.............غور فرمائیے میں پیٹ کے لئے ملازمت کرتا ہوں...... اگر روٹی بھی نہ کھاؤں تو کام کیسے کروں.......!"

میں نے گرم ہو کر جواب دیا:۔

جو کچھ بھی ہو اگر آپ واقعی کام کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو میری شرائط کے مطابق کام کرنا ہوگا۔"

مجھے اُس کی اِس قدر مکمل دلیل بازی اور ہر بات میں اپنی ہی بسکی کے اظہار سے نفرت سی ہو گئی تھی۔

میں اپنے دل میں اس بات کا ضرور متمنی تھا کہ وہ میری ہستی کو بالکل ہی عضو معطل بنا کر نہ ڈال دے۔ بلکہ پروپرائٹر ہونے کی حیثیت سے میرے احساسات کی قدر کرے۔

اُس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت کی میری بات اُسے بے حد گراں گزری ہے، وہ منتظر ہے کہ میں اپنے تخیلات واپس لینے کی طرف توجہ کروں گا مگر میں ان باتوں سے اُکتا سا گیا تھا۔ اور میں نے ایسا نہیں کیا۔

وہ چند لمحوں کے لئے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا رہا۔ پھر اپنی تیز آواز میں بولا:۔

"خانصاحب! اگر آپ سمجھتے ہیں کہ کام چل نکلا ہے اور اب آپ اسے چلالیں گے تو آپ کا یہ خیال سراسر غلط ہے....... اور اگر مجھے

نوکری کرنے کے باوجود فاقہ کرنا پڑے تو میں........آپ جانتے ہی ہیں کہ میں آزادی سے کام کرنے کا عادی ہوں.......اس لئے میں غلامی کے فاقہ پر آزادی کے فاقہ کو ترجیح دوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے کمزور شانوں کو حرکت دی اور سگریٹ پیتا ہوا گھر کو چل دیا۔

سکوت

یہ چھوٹا سا بنگلہ نما مکان شہر کے باہر سول لائنز کے اُس حصہ میں بنا ہوا تھا جس سے آگے چند پلاٹ خالی پڑے تھے۔ لیکن اور کوئی عمارت نظر نہ آتی تھی۔ ایک تو سول لائنز کی یہ آبادی ہی شہر سے باہر تھی اور پھر یہ مکان بھی آبادی کے ایک خاموش گوشے میں تنہا کھڑا ہوا تھا۔ اِس لئے یہاں سرِ شام ہی ہر طرف خاموشی طاری ہو جاتی تھی ——— اور جب تھکا ماندہ شبیر اپنے دوست کے مکان کی طرف قدم بہ قدم بڑھ رہا تھا، تو اُس کی تکان زدہ آنکھیں مکان پر گڑی ہوئی تھیں۔

عموماً جب انسان دن بھر کام کرنے کے بعد واپس لوٹتا ہے تو اُسے ہمیشہ یہی احساس ہوتا ہے جیسے اُس کا مکان بازو کھولے اُس کے استقبال کے لئے کھڑا ہو۔ اور جب وہ اندر داخل ہوگا تو مکان کے اندر حسبِ حیثیت کرسیاں ہوں گی، یا کوچ بچھے ہوں گے، یا کم از کم چارپائی ہوگی........ وہ بیٹھ یا لیٹ کر تھوڑا سا آرام کرے گا۔ پھر

وہاں منہ ہاتھ دھونے کے لئے پانی بھی ہوگا۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد اُس کے کھانے کے لئے بھی کوئی نہ کوئی چیز موجود ہوگی۔ اپنے گھر کی آزادی، امن، جانی پہچانی ہوئی فضا، مکمل راحت وغیرہ تو مسلمہ خوبیاں ہیں۔ لیکن جب شبیر نے اپنے دوست پر نگاہ ڈالی تو اُسے اس قسم کی بات محسوس نہ ہوئی۔ وہ مکان یوں ہی پیلے رنگ کے مینڈک کی طرح بے حس دکھائی دے رہا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اگر وہ اُس کے قریب گیا تو مکان پھُدک کر کہیں دُور جا رہے گا۔ وہ اُس کے پیچھے بھاگتا چلا جائے گا اور مکان پھُدکتا ہوا دنیا کے دوسرے گوشے میں جا پہنچے گا۔ یہاں تک کہ وہ بیچارا کہیں رستے ہی میں تھک کر چوُر ہو جائے گا۔ اور کسی گڑھے میں گر کر کراہتا رہے گا۔ یا کسی جھاڑی میں اُلجھ جائے گا۔ وہاں اُس کے گھٹنے چھِل جائیں گے۔ کانٹوں کے چبھ جانے سے اُس کے جسم میں درد کی ٹیسیں اُٹھیں گی۔

........شبیر رُک گیا۔

اِس مکان سے کس قدر سرد مہری ٹپکتی تھی "خوش آمدید" کہنا تو خیر دُور کی بات تھی۔ بلکہ اگر وہ وہاں سے بھاگ کر مکان سے پرے چلا جائے تو وہ دل کھول کر قہقہے لگائے گا، بغلیں بجائے اور یوم نجات منائے گا.......... کچھ بھی ہو وہ مکان سے پرے بھاگ جانے پر آمادہ تھا۔ لیکن وہ بھاگ کر کہاں جائے۔

یہ اُس کی زندگی کے تاریک دن تھے۔ وہ دنیا میں تنہا تھا۔ بلکہ تنہا چھوڑ دیا گیا تھا۔ باپ نے اپنی ہوس کی سیری کے لئے اُسے لنڈورے چوہے کی طرح اکیلا چھوڑ دیا۔ یہ ایک لمبی داستان تھی۔

باپ کے بھیجے ہوئے وہ روپے جن پر اُس کا گزارا ہو رہا تھا یکایک آنے بند ہو گئے ۔ اُس کی اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور اُس نے ایک اسکول میں چھوٹی سی نوکری کر لی ۔

جس جگہ وہ پہلے رہتا تھا اُسے وہ چھوڑنی پڑی ۔ اُس نے کم کرائے کا چھوٹا سا کمرا تلاش کیا لیکن نہ ملا ۔ وہ عارضی طور پر اپنے دوست کے ہاں آکر رہنے لگا تھا ۔ وہ مثل مشہور ہے ایک دن کا مہمان اس کے بعد شیطان ......

...... چھوٹی سی باڑ کے پیچھے زمین پر اُگی ہوئی گھاس اُس سے پرے مکان .... بے حس، سرد مہر، چپ چاپ .... کھڑکیوں میں سے روشنی دکھائی دے رہی تھی ۔ وہ کس قدر اُداس اور پریشان کُن تھی ۔

تاریکی بڑھتی جا رہی تھی ۔ وہ چپ چاپ گھر کے اندر چلا گیا ۔ اُس کے دوست کے بچے باپ کو دیکھ کر چلّا اُٹھتے تھے ۔ لیکن وہ اُس سے مانوس نہیں تھے ۔ وہ پہلے تو اُسے پہچان نہ سکے ۔ لیکن جوں ہی اُنھوں نے اُسے پہچان لیا مسرت و شادمانی کی چیخیں اُن کے لبوں تک پہنچتی پہنچتی رہ گئیں ۔ دوست کی بیوی اُس سے پردہ نہیں کرتی تھی ۔ وہ بہت اچھے دوست تھے اس لئے اِس قسم کے تکلفات کا دخل ہی نہیں تھا .... لیکن اُس کی بیوی شبیر سے بے تکلف بھی نہیں تھی ۔ جس قدر اُس کا دوست لطیف بدصورت تھا اُسی قدر اُس کی بیوی حسین تھی ۔ دونوں کی جوڑی اور بھی کئی پہلوؤں سے اچھی خاصی بے جوڑ تھی ۔

شبیر سیدھا ڈرائنگ روم میں چلا گیا اور خاموشی سے ایک آرام کرسی پر دراز ہو گیا۔ کسی غیر کے مکان میں آرام کرسی پر دراز ہونا کس قدر اذیت دہ تھا۔ وہ گرمجوشی اور پُرخلوص استقبال کا بھوکا تھا وہ آنکھیں بند کئے کچھ دیر تک یونہی پڑا رہا...... اتنے میں لطیف کے بولنے کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ وہ یونہی سر جھکائے چُپ چاپ بیٹھا رہا۔

بچوں اور بیوی کے ساتھ باتیں کرنے کے بعد لطیف اِدھر چلا آیا........ پہلے پہل جب وہ نیا نیا آیا تھا تو لطیف اُس سے بات کر لیا کرتا تھا۔ اب اگر کوئی بات کہنے کی ہوتی تو وہ بولتا۔ ورنہ یونہی اپنے کام میں مصروف رہتا...... شبیر حد سے زیادہ تھک گیا تھا۔ آج اُس نے نویں درجے کے لڑکوں کے جوابات کی کاپیاں دیکھ کر واپس کی تھیں۔ اس لئے آج سارا دن لڑکوں نے چلا چلا کر اُس کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ ایک تو ذاتی پریشانیاں، بیسیوں اُلجھنیں اور پھر لڑکوں کی کائیں کائیں۔ ان سب پر طرّہ یہ کہ اسکول سے مکان تک تین میل اُڑتی گرد میں پیدل آنا پڑا۔۔۔ اور مکان؟.......... اُس کا جی چاہتا تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے باہر کھیتوں کی طرف نکل جائے۔ وہ لطیف کو سیر کے لئے کہنا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ پہلے ایک مرتبہ اُس نے اُس سے کہا تو اُس نے جواب دیا تھا کہ اُسے کام کرنا ہے۔ اُس نے کچھ اصرار کیا تو لطیف نے ذرا درشت لہجے میں کہا کہ اگر میں سیر ہی کرتا رہوں تو پھر کھاؤں کہاں سے......... اُس دن سے شبیر نے اُسے کچھ کہنا ہی

ترک کر دیا۔ اور آج تو خود اسی کا بولنے کو جی نہ چاہتا تھا۔

وہ دل ہی دل میں باہر جانے کی ٹھان رہا تھا کہ لطیف نے خود ہی اس سے کہا "باہر چلو گے؟"

شبیر منہ سے کچھ نہیں بولا۔ وہ اُٹھ کر اُس کے ساتھ ہو لیا۔ مکان سے سڑکوں پر کوئی اکّا دکّا آدمی نظر آجاتا تھا یا کوئی کتا ایک کوٹھی کی باڑ سے گزر کر دوسری کوٹھی کی باڑ میں گھستا دکھائی دے جاتا۔ وہ دونوں خاموش تھے۔ ہاتھ پیٹھ پر باندھے سر جھکائے وہ آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ سڑک سے گزر کر وہ گرد سے اٹے ہوئے میدان میں سے گزرنے لگے۔ سڑک پر کھڑے ہوئے کھمبے کی روشنی میں اُن کے سامنے پہلے تو خوب واضح طور پر اُن کے کالے کالے سایے حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیتے رہے۔ لیکن جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے، سایے مدھم پڑتے گئے یہاں تک کہ وہ بالکل ہی غائب ہو گئے۔

آگے صرف تاروں کی روشنی تھی......... انسانوں کی آبادی کو وہ پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اُن کے سامنے کھیت تھے۔ پرے بہت دور دو گاؤں درختوں کے جھرمٹ میں گھاس چرنے والی بھیڑوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ وہ موٹروں کا شور، لڑکوں کی ٹائیں ٹائیں، لاریوں کے پہیوں سے اڑتی ہوئی گرد اور پھر کانوں کے پردے پھاڑ دینے والا شہر بھر کی مختلف آوازوں کا گھلا ملا ہوا غل غپاڑہ......... ان سب سے پیچھا چھوٹ گیا تھا۔ شبیر نے لطیف کی طرف اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ وہ بھی اس کی طرح بالکل سنجیدہ سا

ہو رہا تھا۔ اُس کے سر کے بال اُلجھے ہوئے تھے۔ ماتھے پر بل۔ ناک کے نتھنوں کے قریب سے رخساروں کے نیچے جانے والے خطوط خوب گہرے دکھائی دے رہے تھے۔ چونکہ وہ چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی بھی بڑھائے ہوئے تھا۔ اِس لئے اُس کے چہرے سے خشونت کے آثار اور بھی شدید دکھائی دیتے تھے۔

خاموشی سے چلتے ہوئے وہ کھیتوں کے قریب ایک جوہڑ کے پاس جا پہنچے۔ وہ پہلے بھی ہمیشہ اسی جگہ آیا کرتے تھے۔ جوہڑ کا پانی گدلا تھا۔ لیکن گاؤں کے لوگ نہ صرف مویشیوں کو اس میں نہلاتے تھے بلکہ خود بھی اس میں نہاتے اور کپڑے دھوتے تھے۔ دن بھر پانی کی سطح پر صابن کی جھاگ تیرا کرتی تھی۔ البتہ رات کو پانی پُرسکون اور صاف و شفاف نظر آتا تھا۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ دن میں اِس جوہڑ کا نظارہ طبیعت پر کچھ ناخوشگوار اثر ڈالتا تھا۔ لیکن رات کے وقت یہ کاشمیر کی کسی جھیل کی طرح دلکش نظر آنے لگتا تھا۔ چنانچہ آج بھی ململ کی طرح باریک چھوٹی سی بدلی کے پیچھے چھپے ہوئے چاند کی روشنی جوہڑ کے پانی پر جھلملا رہی تھی..... وہ دونوں عین جوہڑ کے کنارے اپنی پُرانی جگہ پر بیٹھ گئے۔

ہوا خنک تھی ہر طرف خاموشی اور امن کی حکومت تھی۔ آسمان قریب قریب بالکل صاف تھا۔ کہیں کہیں بادل کا ہلکا سا ٹکڑا کارواں سے بچھڑے ہوئے یوسف کی طرح آوارہ پھرتا دکھائی دے جاتا تھا۔ تارے ایسے روشن دکھائی دے رہے تھے جیسے اُن کے چہرے خوب اچھی طرح سے دھو دیئے گئے ہوں اور وہ معصوم بچوں کی طرح

آنکھیں جھپکا رہے تھے۔ تاحدِ نگاہ بڑے بڑے کھیت پھیلے ہوئے تھے اور اُفق میں کچھ ایسی کھلی ملی سی پھیلی پھیلی روشنی نظر آ رہی تھی جیسے کوئی مٹھیاں بھر بھر کر گلال ہوا میں اُڑا رہا ہو۔ اِس جگہ انسان کو ایک لامتناہی وسعت، ابدی سکون اور دائمی راحت کا احساس ہوتا تھا۔

وہ دونوں اِس انداز سے بیٹھے تھے کہ اُن کی ایڑیاں زمین پہ ٹکی تھیں گھٹنے اوپر کو اُٹھے ہوئے تھے۔ اور گھٹنوں پر اُن کی کہنیاں ٹکی ہوئی تھیں لطیف کے چہرے سے یوں ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ کسی سے لڑ کر چلا آ رہا ہو۔ شبیر سوچنے لگا۔ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہے۔ یہی میرا دوست کس قدر خوش مزاج اور باتونی شخص تھا۔ لیکن اب اُس کی زبان پہ تالا سا پڑ گیا ہے۔ اگر انسان پر ذرا سی مصیبت آن پڑے تو دوست کھسکنے لگتے ہیں۔ انسان کو آنکھیں بدلتے دیر نہیں لگتی۔ آخر لوگ اِس قسم کا رویہ اختیار کس طرح کر لیتے ہیں۔ کل جس دوست سے بے حد بے تکلفی تھی آج اس سے بات کرنے کے روادار نہیں۔

اِس طرح کے خیالات میں کھوئے کھوئے اُس نے اپنے دوست کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "دوست! میں تمھاری پریشانی کا سبب خوب اچھی طرح سے سمجھتا ہوں۔ یوں تو تم یہی کہتے ہو گے کہ میں بے حیا ہوں جو اِس طرح تمھارے گھر میں ڈیرا لگائے بیٹھا ہوں دونوں وقت روٹی کھاتا ہوں۔ اِس طرح مفت میں تم سب کی پریشانی کا باعث ہو رہا ہوں۔ تم صحیح کہتے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ میں نے تمھیں ایک مصیبت میں گرفتار کر رکھا ہے۔ لیکن میرے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں۔ میں جلد از جلد تمھارے گھر کو خیرباد کہہ دینا چاہتا ہوں

لیکن مجبور ہوں۔ خیر یہ تو رہی میری حالت۔ لیکن تم اپنی کہو۔ کس طمطراق سے تم مجھے اپنے گھر لائے تھے۔ تم نے کہا اسے اپنا گھر سمجھو۔ میری حالت سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ تمھیں میں نے دھوکا دینے کی کوشش نہیں کی۔ سب حالات جانتے ہوئے بھی تم نے مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ اب گلے پڑا ڈھول بجانا پڑا تو گھبرا گئے۔

لطیف نے جیسے اُس کی بات سُن لی ہو۔ اُس نے سر گھما کر اُس کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "بھئی میرے کہنے کی کوئی بات ہے نہیں۔ جو میرے دل میں ہے وہ میری صورت سے ظاہر ہے۔ بال بچے دار آدمی ہوں۔ زیادہ عرصہ تک مہمان اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتا ہر بات کا دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ تم کنوارے ہو تم ان باتوں کو نہیں سمجھتے۔ بلکہ سمجھ ہی نہیں سکتے۔ میں دراصل لاچار ہوں۔ کچھ باتیں میرے بس کی نہیں۔ مجھے تمھارا پورا پورا خیال ہے۔ لیکن ہمارا سماجی نظام ہی کچھ ایسا ہے کہ میاں کچھ بات پسند کرتے ہیں تو بیوی نہیں پسند کرتیں۔ اسی طرح جو بات بیوی کو پسند ہے میاں کو نہیں خیر، یہاں تک تو کوئی ہرج نہ تھا۔ لیکن مشکل یہ آن پڑی ہے کہ ایک دوسرے کے اختلاف برداشت کرنے کو بھی تو وہ تیار نہیں ہوتے۔ اگر ہم ایک بات پر متفق نہیں ہو سکتے...... لیکن کم از کم اختلاف پر رضامند تو ہو سکتے ہیں نا؟ تم میرے دوست ہو لیکن میری بیوی کے نہیں......... جس طرح میری بیوی کی سہیلیاں میری سہیلیاں نہیں ہوتیں....."

عورتوں کا خیال آنے پہ شبیر کا ذہن دوسری طرف کو منتقل ہو گیا

وہ سوچنے لگا کہ عورتیں بھی عجیب بلا ہوتی ہیں۔ اچھے خاصے دوستوں کو ایک دوسرے سے جدا کرکے دم لیتی ہیں۔ مرد بھی دراصل بے وقوف ہی ہوتے ہیں۔ لطیف سے تو خیر اُس کا دو تین برس کا یارانہ تھا۔ اس کے اور بھی پُرانے دوست وہ لنگوٹئے یار، ہم پیالہ و ہم نوالہ۔ کھیل کود میں، شرارتوں میں، باغوں کی چوریوں میں غرض ہر جگہ ساتھ رہتے تھے۔ .... اُس کے راولپنڈی کے دوست رؤف، ہُما، وغیرہ تین تین چار چار روز کے لئے کوہ مری کی سیر کو نکل جاتے تھے۔ سب کس قدر بے فکرے اور نڈر تھے۔ لیکن جب اُن کی شادی ہوگئی........ کئی سال بعد جب وہ راولپنڈی گیا تو اُسے معلوم ہوا کہ اُس کے دوستوں میں سے بیشتر کی شادی ہوگئی ہے۔ پرانے ساتھیوں میں سے کئی دوسرے شہروں میں چلے گئے تھے۔

وہ رؤف جو محض ایک بیکار لڑکا تھا۔ خود اُس کے ابا تو اُسے پڑھنے کے لئے مجبور بھی کرتے تھے۔ لیکن نہ معلوم رؤف کے ابا اُسے کبھی کچھ بھی کہتے تھے۔ کیونکہ جب کبھی آجائے تو بس جانے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔

اور وہ ہُما...... اُسے کیا کام تھا بھلا۔ کچھ نہیں۔ اس کے ساتھ بیج خواہ سارا سارا دن کھیلتے جاؤ۔ اور جب وہ لوگ باہر جایا کرتے تھے تو وہی شرارتیں کرنے میں سب سے پیش پیش رہتا تھا۔ ...... لیکن جب اُس نے اُنھیں کئی برس بعد دیکھا تو ان سب دوستوں کے حلیئے ہی بدل گئے تھے۔

رؤف نے ریڈیو کی دوکان کھول لی تھی۔ جب وہ اُسے ملنے کیلئے

گیا اور پُرانے زمانہ کا ذکر چھیڑا تو وہ کہنے لگا "یار اب کچھ نہ پوچھو... اب وہ بات ہی نہیں رہی ..."

"کیوں بھئی وہ بات کیوں نہیں رہی؟ شبیر کو اُس کی شادی ہو جانے کی اِس وقت تک کوئی خبر نہیں تھی۔ وہ کسی غیر متوقع جواب کا منتظر تھا۔

لیکن اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب رؤف نے جواب دیا "یار اب میری شادی ہو گئی ہے۔"

اسی طرح ہُدا کی بھی شادی ہو چکی تھی۔ پہلے تو اگر جناب ایک مرتبہ مل جائیں تو پھر سارا سارا دن اُس کا ساتھ نہیں چھوڑتے تھے لیکن اب اگر ایک آدھ گھنٹہ اکٹھے بیٹھنا پڑے تو اُٹھ اُٹھ کر گھر کی طرف بھاگتے تھے۔ آخر بیویوں میں ایسی کیا کشش ہوتی ہے کہ بس ایک مرتبہ مرد اُن کے قابو میں آیا اور اُنھوں نے منتر پڑھ کر اُسے گدھا بنا ڈالا......

اب ہلکی ہلکی خنک ہوا چلنے لگی تھی۔ وہ دونوں اپنے اپنے سر کی جلد پہ ہوا کی ٹھنڈک کو محسوس کر سکتے تھے۔ دماغ کی تکان دُور ہونے لگی تھی مکمل خاموشی سے اُن کے اعصاب میں مسرت انگیز راحت کی لہریں دوڑنے لگیں۔ شبیر کا ذہن ماضی کی طرف منتقل ہو گیا...... عورت کیا بلا ہے؟ اس بات کا جواب خود اُسی کا حافظہ دینے لگا۔ یہ اُن دنوں کی بات تھی جب گاؤں کے قریبی قصبے سے دسویں پاس کرنے کے بعد وہ شہر پہنچا اور کالج میں داخل ہو گیا۔ شہر میں اُسے ایک علیحدہ کمرے کی ضرورت تھی

وہ ہوسٹل میں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اِن دِنوں اُس کی ماں اُس کے ساتھ تھی۔ ماں کی ایک سہیلی مل گئی۔ کچھ تو وہ پہلے ہی سے سہیلیاں تھیں کچھ اتنے لمبے عرصہ کے بعد جو ملیں تو بس ایک دوسرے سے لپٹ ہی تو گئیں اور پھر اِس طرح باتوں ہی باتوں میں اس کی بات بھی چھڑ گئی۔ ماں کی سہیلی کا شہر میں اپنا مکان تھا۔ جس میں اُنھیں کا کنبہ رہتا تھا۔ وہ اپنی بیٹھک دینے پر رضامند ہو گئیں۔ ..... اُس نے اُن کی بیٹھک میں رہنا شروع کر دیا۔ اس بیٹھک میں مالکوں کی ایک بہت بھاری لوہے کی پیٹی رکھی تھی۔ وہ اُنھوں نے اُسی جگہ پڑی رہنے دی۔

بیٹھک کا دروازہ ڈیوڑھی کے اندر ہی تھا۔ ڈیوڑھی میں دن بھر عورتیں بیٹھی چرخے کاتا کرتی تھیں۔ رات کو ڈیوڑھی کو اندر سے مقفل کر دیا جاتا تھا۔ اِس لئے اُنھیں کوئی خطرہ نہ تھا۔ باقی رہا شبیر تو وہ اُن کا اپنا بیٹا ہی تو تھا..... البتہ اُنھوں نے یہ ضرور کیا۔ کہ کمرے کی ایک چابی پیٹی میں سے اُسے دے دی اور ایک اپنے پاس رکھ لی۔ تاکہ جب کبھی اُنھیں کسی شے کی ضرورت محسوس ہو تو وہ لے سکیں۔

اُن کی ایک لڑکی تھی۔ کچھ بھلا سا نام تھا حسین تھی جوان تھی بلکہ جوبن کی آمد آمد تھی۔ شبیر تنہائی پسند، خاموش اور شریف لڑکا سمجھا جاتا تھا..... اِس لیے کبھی کبھی وہ لڑکی بھی پیٹی میں سے کوئی زیور یا نقدی نکالنے کے لئے چلی آتی۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوتی تھی تو شبیر مُنہ پھیر کر کتاب کی طرف دیکھنے لگتا کبھی کوئی بات

نہیں ہوتی اُس کی شرافت کی دھوم مچ گئی۔ لیکن ایک روز گرمیوں کی ایک دوپہر کو جب لڑکی پیٹی کھولنے لگی تو چابی سوراخ میں پھنس گئی........ اُس کا دھیان اپنی کتاب کی طرف تھا۔ لیکن اُسے معلوم ہو گیا کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ لیکن وہ چپکا بیٹھا رہا۔ پھر لڑکی نے آہستہ سے کہا "چابی گھومتی نہیں...... اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ لڑکی نے آج تک اُس سے کبھی کوئی بات نہ کی تھی۔ جب اُس نے گھوم کر دیکھا تو وہ اُس کی طرف پیٹھ کئے بیٹھی تھی۔ گویا یہ الفاظ لڑکی نے اُس سے نہیں کہے تھے۔ اُس نے بھی منہ پھیر لیا اور کتاب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟" لڑکی نے کچھ جواب نہ دیا۔ لیکن جب اُس نے دیکھا کہ لڑکی ابھی تک بیٹھی ہے تو اُس نے الخاموشی نیم رضا سمجھ کر اُس کی مدد کرنے کی ٹھانی۔

جب وہ پیٹی کے قریب پہنچا تو وہ چابی اُس کے ہاتھ میں دے کر آپ ذرا پرے سرک کر بیٹھ گئی۔ اُس نے لرزتے ہوئے ہاتھ سے چابی یونہی ایک سوراخ میں ڈالنی شروع کر دی..... لڑکی نے ہاتھ بڑھا کر انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا " ایتھے" یعنی اِس جگہ........

اُس رات اُسے وہ گورا گورا ننھا منھا ہاتھ خواب میں نظر آتا رہا........ دوسرے تیسرے روز جب لڑکی کی ماں گھر پر نہیں تھی وہ اُس سے ایک سوال سمجھنے کے لئے اُس کے پاس آن بیٹھی۔ ...... پھر جب وہ ایک روز کمرے میں آیا تو اُس نے دیکھا کہ اُس کا

کمرہ شیشے کی طرح چمک رہا ہے۔ اُس کا بے ترتیبی سے پھیلا ہوا سامان کرسیاں، میز، کپڑے کتابیں سب ٹھکانے سے رکھے ہیں.... اور پھر اسی طرح اُس کا کمرہ صاف رہنے لگا۔ اُسے صبح کے وقت میٹھے بسکٹ گلاس اور مکھن بھی ملنے لگا۔ ایک روز لڑکی کے ہونٹوں سے اُس کے ہونٹ پیوست ہو گئے۔ لڑکی کی ٹانگوں سے چھو کر اُس کی ٹانگیں زور زور سے کانپنے لگیں۔۔ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ چند دنوں بعد اُس نے گھومنا، پھرنا، دوستوں کے ساتھ کھیلنا اور تھیئٹر وغیرہ دیکھنا سب کچھ بند کر دیا تھا.....

دفعتہً شبیر کی نظریں اوپر کو اُٹھ گئیں۔ چند بڑے بڑے پرندے نہایت خاموشی سے پر ہلاتے ہوئے اُن کے سروں کے اوپر سے گزر گئے۔ وہ دُور چلے جا رہے تھے اور پھر لحظہ بہ لحظہ بلند سے بلندتر ہوتے جا رہے تھے۔ یقیناً اُن کی کوئی نہ کوئی منزل ضرور ہوگی۔ یونہی بلا مقصد تو نہ اُڑ رہے ہوں گے۔ لیکن کیسی خاموشی کے ساتھ کس پراسرار انداز سے وہ اُڑے جا رہے تھے۔ ...... پرے ہی پرے ...... اُس نے اپنے دوست لطیف کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا کہ اس کا نام لطیف کس نے رکھ دیا۔ صورت سے تو لطیف نہیں ہے........ یہ سوچ کر اُس نے دل ہی دل میں ہنس کر اپنے آپ کو داد دی.......... اور وہ لطیف ابھی تک اُس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ "میرے خیال میں اب تم سمجھ گئے ہو گے......"

"نہیں نہیں.......... میں کچھ نہیں سمجھا...... تم عورت کی بات

کہہ رہے تھے ......"

شبیر پھر غور کرنے لگا۔ اُس نے پیچھے جھک کر ہتھیلیاں زمین پہ ٹیک دیں۔ اب وہ پہلے کی نسبت کچھ مطمئن تھا۔ اُس نے دوست کی طرف دیکھا جیسے ......" ہاں بھائی! عورت کی بابت جو تم نے کہا وہ دُرست ہے۔ میرا بھی یہی تجربہ ہے ..... کسی نے کہا ہے کہ عورت مرد کو زمین کی طرف کھینچے رکھتی ہے۔ وہ اُسے اس فانی دنیا ہی کا بنائے رکھتی ہے۔ اگر عورت نہ ہو تو مرد نہ معلوم کن رفعتوں کی طرف پرواز کر جائے۔

عورت بے وقوف بھی تو پرلے درجے کی ہوتی ہے۔ جب رات کو ہم تم دونوں کھانا کھانے کے بعد بیٹھے بات چیت کرتے ہوتے ہیں تو تمھاری بیوی دوسرے کمرے میں سے ہاتھ سے اشارے کرتے ہوئے کہتی ہے۔ اجی ... میں نے کہا..... ذرا .... اِدھر سنئے"

تم انجان بن کر پوچھتے ہو" سجئی کیا ہے ؟"

وہ کنکھیوں سے تمھاری طرف۔ خاص تمھاری طرف دیکھتی ہوئی پھر ہاتھ سے اشارے کرتی ہے ..... تم بظاہر برہم ہو کر بڑبڑاتے ہوئے چل دیتے ہو۔ اور پھر جب واپس آتے ہو تو ہر چند تم اپنی مونچھیں بڑی احتیاط سے صاف کر کے آتے ہو مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ تمھاری بیوی نے تمھیں دودھ پینے کے لئے بلایا تھا۔ اور تم مجھ سے چوری سے دودھ پی کر معصوم صورت بنائے آ گئے ہو۔ .... حالانکہ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ جب تم نے اندر جا کر

اپنی بیوی کو ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھامے ہوئے دیکھا ہو گا۔ تمھاری باچھیں کھل کر دونوں کانوں سے چھو گئی ہو نگی۔۔۔۔۔۔۔۔ ذرا سوچو کہ کیا تم۔۔۔۔۔ جو اتنے عقلمند بنے پھرتے ہو اس کی کوئی بہتر تجویز نہیں سوچ سکتے ؟"

لطیف نے مجرموں کی طرح سر جھکا لیا جیسے اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہا ہے " بھئی درست ہے۔ خدا نے مہمان کا درجہ بہت بلند رکھا ہے میں۔۔۔۔۔۔ در اصل۔۔۔۔۔۔ انسان واقعی بہت کمزور ہے میں بھی ایک انسان ہی تو ہوں۔ مجھ سے بھی غلطی ہو ہی جاتی ہے۔۔۔۔۔۔۔ میں بھی کمزور ہوں۔۔۔۔۔ یار! واقعی تم ہو تکلیف میں۔ میں جانتا ہوں تم ایک ذمہ وار دوست ہو۔ تم سے جب کبھی ممکن ہو گا، تم چلے جاؤ گے اور بھئی اگر اس موقع پر میں تمھارے کام نہ آیا تو کب آؤں گا ؟"

شبیر کے دل کی کدورت دُور ہونے لگی۔ وہ کچھ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اِس طرح اپنے خیالات میں گم اُس نے دُور کھڑے ہوئے دو درختوں کی طرف دیکھا۔ یہ دو درخت بھی دور سے کچھ عجیب ہی نظر آتے تھے جیسے وہ دونوں سرگوشی میں ایک دوسرے سے باتیں کر کے ہنس رہے ہوں۔

شبیر مہمانوں کی بابت سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے پھر لطیف کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔۔۔۔۔۔ " بھئی میں مانتا ہوں کہ مہمان میزبان کی بابت تو سب کچھ سوچتے ہیں۔ اُس کے فرائض کی لمبی سی فہرست تیار کر لیتے ہیں۔ لیکن کبھی اپنے فرائض پر غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ بیشک مہمان کی یہی کوشش ہونی چاہیے

کہ وہ میزبان کی تکلیف کا باعث نہ بنے۔ اور میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ میری بھی یہی کوشش ہوتی ہے۔ میں نہیں جانتا شاید مجھ سے بھی غلطی ہو ہی جاتی ہو۔ یعنی باوجود اس قدر احتیاط کے بھی..... ممکن ہے... لیکن بھئی تم تو بعض اوقات یونہی بگڑ جاتے ہو۔ مثلاً اُس دن کیا بات کی تھی میں نے؟ یہی ناکہ آؤ ذرا باہر کھیتوں کی سیر کر آئیں۔ اِس پہ تم فوراً بگڑ گئے تم نے مجھے کچھ ایسی باتیں کہہ ڈالیں جو درحقیقت بالکل دُور از کار اور بے معنی تھیں۔ ظاہر ہے کہ میری بات بالکل بے ضرر تھی۔ تم پر جو اس قدر شدید ردِّ عمل ہوا وہ بالکل بے جا تھا۔۔"

لطیف نے اپنی انگلی منہ میں دبا رکھی تھی۔ اِس وقت اُس کی آنکھیں پہلے کی طرح سکڑی ہوئی نہیں تھیں اور نہ اُس کے چہرے کے خطوط پہلے کی طرح مسخ ہو رہے تھے۔ اِس وقت اُس کے چہرے سے ملائمت ٹپک رہی تھی۔ اُس کی دونوں بھوؤں کے درمیان کی لکیریں اس وقت پہلے کی نسبت مدھم دکھائی دے رہی تھیں اور آہستہ آہستہ معدوم ہو رہی تھیں۔ اُس نے ایک گہری سانس لی۔ سینہ خوب اچھی طرح سے پھلا لیا۔ پھر اُس نے آنکھیں موند لیں اور پیچھے کی طرف جھک گیا جیسے کہہ رہا ہو " واقعی بعض اوقات انسان دیوتا بن جاتا ہے اور کبھی بالکل ہی شیطان کی صورت اختیار کر لیتا ہے بھئی یقین مانو تمھارے یہاں ٹھہرنے سے مجھے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ جہاں اور اتنے لوگ کھانے والے ہیں تم بھی ان میں شامل ہو گئے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ بھئی خدا گواہ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے اور دیکھو نا یار بعض دفعہ میرا موڈ ہی کچھ بگڑا ہوا ہوتا ہے۔ مجھ ہی پر کیا

منحصر، ہر آدمی کا یہی حال ہے .... کبھی کبھی دفتر میں جھگڑا ہو جاتا ہے۔ ہمارے عملے کے آدمی ایسے بدخصلت ہیں کہ ہمیشہ لگائی بجھائی میں مصروف رہتے ہیں یعنی جس کام کی تنخواہ پاتے ہیں اُس کی طرف تو دھیان دیتے نہیں ایک دوسرے کی جڑیں کاٹنے میں مصروف رہتے ہیں .... اور پھر بڑے افسروں کا تو خیر پوچھنا ہی کیا ہے۔ وہ بھی ایک ہی کمبخت ہوتے ہیں۔ اِن لوگوں کا نہ تو اپنا دماغ ہوتا ہے نہ کان نہ آنکھ .... بس جو کچھ ان کے پٹھوؤں نے کہہ دیا انھوں نے چپ چاپ اُسے تسلیم کر لیا۔ بھئی میں تو بعض اوقات پریشان ہو جاتا ہوں۔ تم جانتے ہی ہو میں نہ تو اِس قسم کی باتیں کرنا پسند کرتا ہوں اور نہ سُننا .... کئی دفعہ دل چاہا استعفیٰ داخل کر دوں۔ جان چھوٹے ..... بس اِن چھوٹے چھوٹے بچوں اور بیوی کا خیال آتا ہے تو دل مسوس کر رہ جاتا ہوں۔"

شبیر نے جوتے اتار دیئے اور پاؤں زمین پر ٹیک دیئے۔ اُس کے پاؤں کے تلوؤں سے زمین کی ٹھنڈک اُس کی آنکھوں تک پہنچ گئی۔ اُس کی قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ ہوا کے سرد جھونکے گریبان میں گھُس کر اُس کی بغلوں میں گدگدی کر رہے تھے اُنھوں نے اِدھر اُدھر گھوم کر دیکھا۔ دُور سے گاؤں چاند کی چاندنی میں سوئے ہوئے نظر آتے تھے۔ وہاں چلتی پھرتی زندگی کے آثار دکھائی نہ دیتے تھے۔ کوئی روشنی، کوئی حرکت، کوئی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ سِول لائنز کی طرف سڑکوں پر کھڑے ہوئے بجلی کے کھمبے بھی ایسے دکھائی دیتے تھے جیسے کھڑے

کھڑے اونگھ گئے ہوں۔ اور اُن کی روشنی بھی خوابناک سی تھی۔ بادل کا اِکا دُکا ٹکڑا آسمان پہ سبک خرامی سے اُڑتا نظر آجاتا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ خاموشی کوئی ایسی متبرک شے تھی جسے توڑنے سے وہ بہت احتراز کرتے تھے۔

شبیر کو لطیف کا انکسار اور جھکے ہوئے سر کا انداز اِس قدر پسند آیا کہ اُس نے نہ صرف اُسے سب کچھ معاف کر دیا۔ بلکہ وہ یہ سوچنے لگا کہ کیا کبھی ایسا موقع بھی آئے گا جب وہ اِس کے لئے کچھ کر سکے۔ وہ زمین سے ہاتھ اُٹھا کر پھر پہلے کی طرح آگے کو جھک کر بیٹھ گیا۔ اُس کے ذہن سے سارے دن کی تھکاوٹ دُور ہو گئی آج اُسے لڑکوں نے کس قدر زیادہ پریشان کیا تھا۔ اِن میں ہر ایک کو اس سے یہی شکایت تھی کہ اُسے کم نمبر ملے ہیں۔ ان سے نپٹنا اُس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اسے خواب میں بھی یہ خیال نہیں تھا کہ اُسے یہ کام بھی کرنا پڑے گا۔ اِس پر اتنی قلیل تنخواہ اور پھر دھوبی کے اس روایتی کتے کی طرح نہ گھر کا نہ گھاٹ کا.......لیکن اب اُس کی طبیعت ہشاش تھی اور دل خوشی سے لبریز تھا۔

لطیف کا دفتر والوں سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ وہ ان کی ذلیل حرکتوں سے پہلے ہی تنگ آچکا تھا۔ آج تو حد ہو گئی تھی۔ آج تو اُس نے صاحب کے پاس پہنچ کر سارا زہر اُگل دیا۔ وہ آپے سے باہر ہو رہا تھا۔.....صاحب نے اُس کا یہ رنگ دیکھا تو اُس پہ سکتہ سا طاری ہو گیا۔ لیکن لطیف نے پروا نہیں کی۔ اُس نے سوچا جو ہو سو ہو آج تو اُسے جو کچھ کہنا ہے وہ کہہ کر رہے گا۔

..... جب وہ بول چکا تو اُس نے دیکھا کہ عملے کے سب لوگ اِدھر اُدھر سے صاحب کے کمرے میں جھانک رہے ہیں۔ صاحب نے سب کو چلے جانے کا حکم دیا۔ اُس کو جو کچھ کہنا تھا سو کہہ چکا تھا۔ اب اُس پر خوف طاری ہونے لگا۔ دیکھیں اب صاحب کا کیا حکم ہو ..... صاحب نے نرم آواز میں یہی کہا کہ میں پوری تفتیش کرونگا ..... اسی وجہ سے اُس کی طبیعت اور بھی زیادہ مضمحل ہو رہی تھی۔ لیکن اب وہ بے پروا ہو بیٹھا تھا۔ اُس کے جسم اور ذہن کی تکان دُور ہو چکی تھی۔ زندگی خوشگوار نظر آنے لگی تھی۔ اُسے کیا پروا اگر کل صاحب اُسے نوکری سے بھی برخاست کر دے تو اِس وسیع اور عریض دنیا میں اُس کے سر چھپانے کے لیے جگہہ کی کچھ کمی نہ تھی۔ اب وہ پہلے کی نسبت اپنے دل میں ایک نئی امنگ محسوس کر رہا تھا۔ اُسے زندگی کی دشوار گزار گھاٹیاں عبور کرنا محض ایک کھیل معلوم ہو رہا تھا۔

ہوا کچھ تیزی سے چلنے لگی۔ لیکن اِس قدر تیزی کے ساتھ بھی نہیں کہ درختوں کے پتے تالیاں بجانے لگیں یا سائیں سائیں کی آواز آنے لگے۔ جوہڑ کے پانی کی سطح پر چھوٹی چھوٹی لہریں اُٹھنے لگیں۔ اور چاند کا عکس سنہری کشتی کی طرح ہچکولے کھانے لگا بعض اوقات تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ کشتی بڑی تیزی کے ساتھ بڑھی چلی جا رہی تھی۔ لیکن باوجود ہچکولوں کے کشتی وہیں کی وہیں تھی۔ ہوا کے خنک جھونکے پہلے تو کھیتوں میں اُگے ہوئے پودوں کے ہمراز بنے اور پھر اُن پودوں کی نمدار زمین اور گھاس کی بھینی بھینی

خوشبو اُڑاکر اُن دونوں کے قریب سے گزرتے ہوئے آسمان کے پرندوں کی طرح نئی زمینوں کی طرف اُڑ گئے۔ اور وہ بیکراں خاموشی گہری ہوتی گئی۔ کسی آواز کا نام و نشان تک نہ تھا۔ زمین کا ذرہ ذرہ اپنی جگہ ساکن پڑا تھا۔ رات بھیگتی جا رہی تھی۔ سکوت بڑھتا جا رہا تھا۔۔۔۔۔ اور پھر اس گہرے اور متبرک سکوت میں سے ایک نئی آواز نیا نغمہ بلند ہوا۔۔۔۔۔۔ لیکن ایسی آواز۔۔۔۔ کہ اس آواز اور مکمل خاموشی میں حدِ فاصل قائم کرنا قریب قریب ناممکن تھا دھرتی کی چھاتی پر اُگی، بچھی، بہتی اور چلتی پھرتی ہر شئے اُسے سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہو گئی۔

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ لطیف نے جیب ٹٹول کر سگریٹ کیس نکالا اور ان دونوں نے ایک ایک سگریٹ منہ میں لے لیا۔ سگریٹ سلگا کر لطیف نے دھواں اُڑاتے ہوئے کوئی مزے دار بات سنانے کے لئے منہ کھولا۔

روشنی

فلیٹ نمبر ۱۲ والے بیچ کے کمرے کی کھڑکی میں سے آسمان دکھائی دے رہا تھا۔ آسمان کی رنگت ایسی تھی جیسے کسی مصور نے کھردرے کاغذ کی سطح پر گدلے، پھیکے اور مٹیالے رنگ پھیلا دیئے ہوں۔ لیکن بے ترتیب اور بلا توازن۔

کمرے کے فرش پر دو پاؤں الٹی طرف کو ہٹ رہے تھے یہ دو پاؤں تقریباً چودہ سالہ لڑکے تھے، میلے، گیلے، پھولے ہوئے۔ اور دو پاؤں آگے کی طرف بڑھ رہے تھے جرابوں میں لپٹے ہوئے بڑے بڑے پاؤں۔ پنڈلیوں پہ کالے کالے گھنے بال۔

"حرامی کے بچے! آئینہ اوپر کو رکھ"

حرامی کے بچے نے پہلے اپنی ناک میں سے تیز سرر کی آواز نکالی اور منہ کھول کر آئینہ اوپر کو اٹھا دیا۔

"آؤ میری بلی!"

بلی خاموش تھی ـــــ رنگین گرم کپڑوں میں لپٹی ہوئی۔ اسوقت اس کے چھوٹے چھوٹے نرم اور گورے ہاتھ دستانوں سے باہر تھے۔ آنکھوں میں نیند کا ساخمار تھا۔ گال خوب پھولے ہوئے تھے۔

"لو ہم نے تو ڈاڑھی پر الٹی طرف سے بھی استرا پھیر ڈالا ـــــ یعنی ہمارے کٹو کی روز روز کی شکایت بھی رفع ہوئی۔ اب چاہیئے کہ ہماری کٹو بھی رانوں پر حلوا باندھا کرے ...."

ہماری کٹو نے جبیں بجبیں ہو کر آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ اس نے دیکھا کہ ہماری کٹو اس بات پر کچھ برہم سی نظر آتی ہے۔

"کیوں بے کتے کے پلے تو ان باتوں کو سمجھتا ہے؟" آئینہ اوپر کو رکھ ؟"

کتے کے پلے نے الو کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر صابن کی جھاگ میں بلتے ہوئے ہونٹوں کی طرف دیکھا۔ پھر اس کی ناک میں سر کی تیز آواز پیدا ہوئی ـــــ اور اس نے نیچے کا جبڑا ڈھیلا چھوڑ دیا اور اس کا منہ بے معنی طور پر کھل گیا......

"سگریٹ پی لو یا ڈاڑھی ہی مونڈ لو...."

"لو یہ پھل کر رکھدیا سگریٹ ہم نے ـــــ اور کچھ؟"

"کتنے کے سگریٹ پیتے ہو ہر روز؟"

"سگریٹ یا سگار بھی؟"

"سگار بھی"

"پائپ بھی؟"

"پائپ بھی"

"یہی آٹھ دس سگار، بیس تیس سگریٹ، پانچ یا چھ یا حد ہے آٹھ مرتبہ پائپ"

"کتنے کے؟ — میں پوچھتی ہو..."

"یہی دو روپئے کے"

"کتنے عرصے؟"

"یہی کوئی تیس سال سے"

"اگر تم اتنے روپئے جمع رکھتے تو آج وہ سامنے کی بلڈنگ تمھاری ہو سکتی تھی"

"اوہو ہو ہو واہ وا — یہ لطیفہ کہاں سے پڑھا تم نے.....

..... سچ سچ کس نے بہکا دیا ہماری کٹو کو؟"

"————"

"خفگی؟ چپ؟ — دیکھو ڈارلنگ!

میں تو یونہی..... ہاں بھئی کونسی بلڈنگ؟..... وہ پیلے رنگ کی؟..... اچھا تو وہ جس پر ہوٹل ڈی پیلس لکھا ہوا ہے؟..... ایں؟..... نہیں؟.... تو وہ کہو نا جس پر رات کو نیلے حروف چمکتے ہیں؟...... اوہو تو تمہارا مطلب اس سیٹھ ڈھینگرہ کی بلڈنگ سے ..... ہاں ہاں یوں کہو یعنی سب سے اونچی..... ارے بھئی جس کے پیچھے چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے یہ جھونپڑیاں بھی خوب ہیں میں انھیں دیکھتا ہوں تو مجھے نوشیرواں کے محل کے پاس بڑھیا کی جھونپڑی

یاد آجاتی ہے تم نے وہ قصّہ پڑھا ہے؟"

جدید طرز کی بڑی بڑی عظیم الشان عمارتوں کے ساتھ ساتھ جھونپڑیوں کا یہ سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ عمارتیں اگر زمانۂ حال کی جدت طرازیوں کے اعلیٰ نمونے تھیں تو جھونپڑیاں ان عظیم الشان عمارتوں کا منہ چڑاتی تھیں۔ انسان کی عظمت اور ذلت ہاتھ میں ہاتھ دیئے کھڑی تھیں۔ اونچے مکانوں والے جھونپڑیوں کو ہر روز دیکھتے تھے۔ جھونپڑیوں کے رہنے والوں ان فلک بوس عمارتوں کو بلا ناغہ دیکھا کرتے تھے۔ اور وہ ایک دوسرے کے اسقدر عادی ہو گئے تھے کہ جھونپڑیوں کے مکینوں کو اونچے مکان والے کی عظمت کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ اور اونچے مکانوں کے رہنے والوں کو اپنی ذات کا احساس ختم ہو گیا تھا۔

یہ بھیک مانگنے والوں کی بستی تھی۔ باقی شہر کے بیچوں بیچ رہتے ہوئے اُن سے علٰحدہ ان کی دنیا ہی اور تھی۔ یہاں کا اخلاق اور قوانین الگ تھے۔ اس جگہ زندگی کے نظریئے ہی اور تھے۔

یہاں پر جھوٹ ٹھگی فریب کا اتنا ہی زور تھا۔ جتنا کہ اونچے محلوں میں۔ اپنی اس پست حالت سے ان بھکاریوں کو کوئی عبرت حاصل نہ ہوتی تھی۔ انھوں نے اس سے ادبیر اٹھنے کا خیال ہی ترک کر دیا تھا ان کے سامنے یہ سوال ہی نہ تھا۔

ان کی زیادہ سے زیادہ جس حد تک پرواز ہو سکتی تھی وہ اسے بخوبی سمجھتے تھے۔ اپنے دائرہ سے نکلنے کی جد وجہد کرنا تو دور کی بات رہی اُنھوں نے اِس قسم کی باتیں کبھی سوچی تک نہ تھیں۔ اور درحقیقت اِس قسم کے خیالات کا اُن کے دل میں پیدا ہونا ہی ان کے قیاس سے باہر تھا۔ محرومی اور مظلومیت کا اظہار کرنا ان کے ہاں فن کا درجہ رکھتا تھا اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ درحقیقت وہ اپنے آپ کو مظلوم سمجھتے تھے۔ وہ بالکل آزاد تھے وہ جو چاہتے تھے۔ مظلوم ہوتے ہوئے انھیں خیال تھا کہ وہ مظلوم نہیں۔ اپنے حقوق پامال ہو جانے پر بھی وہ یہی سمجھتے تھے کہ ان کے حقوق محفوظ ہیں۔ بھوک ان کے لئے ایک قدرتی بات تھی اس قدر قدرتی کہ انھیں یہ معلوم ہی نہ تھا کہ ہر ایک مرتبہ دسترخوان پر بیٹھ کر پیٹ بھر کر نفیس غذا کھانا کیا ہوتا ہے۔ اس لاعلمی کی وجہ سے ان کے دل مطمئن تھے۔

اپنے محدود دائرے میں وہاں بھی اچھے اچھے دولت مند بستے تھے۔ جنھوں نے مانگ مانگ کر بہت بڑی بڑی رقمیں جمع کر لی تھیں۔ وہاں اپنی حدود کے اندر ظالم بھی تھے مظلوم بھی۔ طاقتور بھی تھے کمزور بھی۔ بہادر بھی تھے بزدل بھی۔ موجودہ نظام کی سب سے بڑی لعنت یہ ہے کہ انسان ہر شے سے محروم ہوتے ہوئے بھی یہی سمجھتا ہے کہ اس پر کوئی پابندی نہیں۔ وہ آزاد ہے۔ جو جی میں آئے کر سکتا ہے۔ جو دل چاہے حاصل کر سکتا ہے۔ جدھر چاہے جا سکتا ہے۔ انسان روز ازل

سے اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہے لیکن خود فریبی کی یہ انتہا پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔

ان بھکاریوں میں ایک وہ شخص ہے جس نے اپنے کمسن بچے کی دونوں ٹانگیں کاٹ کر اسے اپاہج بنا دیا تاکہ اس کے نام پہ روپیہ جمع کر سکے۔ وہ خود اچھا خاصا موٹا تازہ شخص ہے اگر واقعی کوئی مہذب سوسائٹی موجود ہو تو وہ ایک اچھا شہری بن سکتا تھا۔ لیکن نہیں۔ آخر ہمارے نظام کی کونسی کل خراب ہے کہ جس کی وجہ سے ایک طرف دن رات گلا پھاڑ پھاڑ انسانیت کا ڈھول پیٹنے والوں کے کان پہ جوں نہیں رینگتی اور وہ ایسے جرائم سے چشم پوشی کر لیتے ہیں۔ اور دوسری طرف ایک پست انسان اسقدر پست تر ہو چکا ہے کہ اس قسم کے گھناؤنے فعل کرنے سے باز نہیں آتا۔

ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو اپنے بچوں کے بازو اور ہاتھ کاٹ کر یا آنکھیں بیکار کر کے انھیں کرائے پر دے دیتے ہیں۔ بھیک مانگنے والوں کو ایک بہانا چاہیئے۔ جسے بھیک مانگنی ہوتی ہے وہ ان میں سے کوئی اولاد یا لنگڑا بچہ اٹھا کر بازار کو چل دیتا ہے۔

وہ لوگ بھی انھیں میں شامل ہیں جو ایک اپاہج شخص کو چار پہیوں والے لکڑی کے صندوق میں بٹھا کر بازاروں میں گھماتے ہیں۔ اور خود صحیح و سالم پانچ چھ آدمی کھڑتالیں بجاتے ہوئے آگے آگے چلتے ہیں۔ اس ایک شخص کے سر پہ وہ

سب روٹی کھا لیتے ہیں۔

اِس قسم کے لوگ بھی ہیں جو بھیک مانگ مانگ کر مالدار ہو گئے ہیں۔ لیکن وہ اپنے روپئے زمین میں گاڑے جا رہے ہیں۔ نہ معلوم وہ اس کا کیا کریں گے۔ بعض فقیر اسی طرح مرجاتے ہیں اور جب اُن کی جھونپڑیوں کے اندر زمین کھودی جاتی ہے تو بڑی بڑی رقمیں مل جاتی ہیں۔ اِن میں ایسے انسانوں کی بھی کمی نہیں جو آپس میں ایک دوسرے کے ہاں چوریاں کرتے ہیں۔ وہ شیطان لڑکے گھومتے رہتے ہیں انھیں معلوم ہوتا ہے کہ فلاں بڑھیا کی فلاں کٹوری میں پیسے جمع رہتے ہیں فلاں بھکاری اپنی کمائی ایک چیتھڑے میں باندھ کر آٹے کی فلاں ہانڈی میں چھپا کر رکھتا ہے۔

سارا سارا دن بھیک مانگنے اور دُکھ بھری صدائیں لگا لگا کر لوگوں کو دعائیں دینے والے جب شام کے وقت سُستانے کے لئے بیٹھتے ہیں تو حالات اور واقعات پر اسی طرح تبصرہ کرتے ہیں جیسے اونچے مکانوں والے۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی مکاریوں اور جعلسازیوں کا اسی فخر سے ذکر کرتے ہیں جس طرح کہ اعلیٰ اور متوسط طبقے کے لوگ کرتے ہیں۔

ان میں بعض بہت شریر، بعض بدمعاش، بعض چور، بعض دھوکے باز، بعض ایماندار اور بعض بھگت مشہور ہیں۔ اِن بھگتوں میں چالیسوں کا نام بھی لیا جاتا ہے ــــــ جن لوگوں کو ہمارے اس طبقے سے جسے ہم بھکاری کہتے ہیں کچھ دلچسپی رہی ہے وہ جانتے ہیں کہ اِن میں بعض ہستیاں واقعی بہت پُراسرار ہوتی ہیں۔

اِن میں بعض ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو پہلے کبھی اچھے خاصے

کھاتے پیتے ہنستے کھیلتے شہری تھے ۔ لیکن پھر اُن کے دماغ کو کوئی ایسا صدمہ پہنچا کہ وہ حواس کھو بیٹھے ۔ اِدھر اُدھر گھومتے رہے اور پھر ان بھکاریوں میں جا ملے ۔ اِن میں سے کئی تعلیم یافتہ بھی ہوتے ہیں اور ہم بعض مرتبہ ہم بازار میں گزرتے ہوئے کسی بھکاری کو شستہ انگریزی میں اپنے آپ ہی سے گفتگو کرتے دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں ۔ اِن میں سے بعض کے حواس قائم ہوتے ہیں ۔ لیکن دماغ کا کوئی نہ کوئی پیچ ڈھیلا ہو جاتا ہے ۔ یا زندگی میں اُن کو کوئی اس قسم کا حادثہ پیش آتا ہے کہ اُن کے لئے گھڑی کی سوئیاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رُک جاتی ہیں ۔ رواں دواں زندگی کو بریک لگ جاتی ہے ۔ اُن کا ذہن آگے بڑھنے سے انکار کر دیتا ہے ۔

چانتو بھی کچھ اسی قسم کا انسان نظر آتا تھا ۔ وہ کون تھا ؟ کہاں سے آیا ؟ کسی کو اس بات کا کچھ علم نہ تھا ۔ جس طرح کوڑے کرکٹ کے بڑے ڈھیر پر کہیں سے ایک اور ٹوکری آن گرتی ہے ۔ اسی طرح ایک روز اُن کی بیسیوں غلیظ جھونپڑیوں میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا ۔ جب وہ پہلے پہل آیا تو اِدھر اُدھر کے بھکاری آتے جاتے اُس کے قریب رُک جاتے تھے اُس سے باتیں کرتے ۔ لیکن وہ باتیں نہ کرتا تھا ۔ وہ دوسروں ہی کی طرح غلیظ تھا ۔ اُس کی صورت سے جہالت کے آثار اسی طرح ہویدا تھے جیسے دوسروں کے چہروں کے ۔ اِس کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ ہو گی ۔ وہ اکہرے بدن کا ایک معمولی شخص تھا ۔ اُس کے بال بڑے سخت اور کانٹوں کی طرح اُٹھے ہوئے تھے ۔ اُس کی پیشانی تنگ تھی اُس کی آنکھوں کے گوشوں پر چھوٹی چھوٹی لکیروں کا اجتماع ہو رہا تھا ۔

ناک کے نتھنوں کے قریب سے دو لکیریں پھیل کر نیچے تک چلی گئی تھیں۔
وہ کھوئی کھوئی نظروں سے خلا میں ایسے گھورا کرتا تھا۔ جیسے وہ تاریکی
میں دیکھ رہا ہو اور اُسے کچھ بھی نہ دکھائی دے رہا ہو۔ اُس کی آنکھیں
معمول سے زیادہ کھلی رہتی تھیں۔ اگرچہ اُس نے اپنے منہ سے کبھی ایک
لفظ تک نہ نکالا تھا لیکن اس کے منہ کی بناوٹ ایسی تھی جیسے وہ ابھی کچھ
کہے گا۔ کوئی بڑی زوردار بات کہے گا۔ ایسی زمین اور آسمان کے درمیان
ساری فضا گونج اُٹھے گی۔ لیکن وہ کچھ نہیں کہتا تھا۔ ہر گھڑی یہی گمان
ہوتا تھا کہ وہ اب بولا تب بولا۔ لیکن اُس کے لبوں میں ایک مبہم سی حرکت
پیدا ہوتی اور پھر وہ کچھ کہے بغیر رہ جاتا۔

پہلے پہل جب وہ لوگ اس نئے آدمی سے واقفیت پیدا کرنے کے
لئے گئے تو بظاہر وہ انکی طرح بھلا چنگا نظر آتا تھا۔ لیکن جب اُنھوں نے
کوئی بات پوچھی تو اُس نے جواب نہیں دیا۔ تو پھر تندو مسخرے نے اُس کی
بانہہ کھینچ کر کہا " ابے ٹھٹنی کے بول ..... بولتا کیوں نہیں "

اس وقت چالیسوں نے معاً اُس کی طرف دیکھا اور اُس کا منہ
بالکل ایسے دکھائی دینے لگا جیسے وہ ابھی کچھ نہ کچھ کہہ ڈالے گا۔
سب لوگ ہنستے ہوئے پیچھے کی طرف سرک گئے۔ لیکن اُس نے
کچھ نہ کہا۔ البتہ اُس کا منہ اُسی طرح بنا رہا۔

ایک بیوہ نے اُسے اپنے جھونپڑے کے ساتھ ہی ایک نیا جھونپڑا
بنا دیا اور وہ اُس میں رہنے لگا۔

اُس کے اس بستی میں آجانے سے یہاں کے رہنے والوں کے
معمول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اُنھوں نے کسی قسم کی تبدیلی محسوس نہیں کی۔

پہلے چند لڑکوں نے اُسے چھیڑا اور اُسے چالنسو چالنسو!! کہہ کر پکارنے لگے۔ اور پھر سبھی اسے اسی بے معنی نام سے یاد کرنے لگے۔ اس نے جھونپڑے کے باہر چار اینٹیں جوڑ کر چبوترا سا بنا لیا۔ فرصت کے وقت وہ ان اینٹوں پر جا بیٹھتا۔ بیٹھے بیٹھے یونہی فضا میں اسطرح دیکھنے لگتا جیسے اسے کوئی خاص شئے نظر آ گئی ہو۔ یا جیسے وہ کسی دھندلی یا چھپی ہوئی چیز کو دیکھنے کی کوشش کر رہے ہوں وہ آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کر لیتا اور سر گھما گھما کر بڑے غور سے دیکھنے لگتا۔ اور پھر کبھی اس کی گردن تن جاتی۔ نتھنے لرزنے لگتے اور اسکے منہ کی کچھ ایسی صورت بن جاتی جیسے وہ کچھ کہنے کو ہو۔ کوئی بڑی پرزور بات۔ لیکن وہ چپ رہ جاتا۔ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اس کی کوئی شئے کھو گئی ہے جسے وہ ڈھونڈ رہا ہے۔ جو اسے صاف طور پر دکھائی نہیں دیتا یا روشنی کی کمی کی وجہ سے دیکھ نہیں سکتا۔ جیسے اسے کوئی بڑی اہم بات کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ اس نے وہ بات کہنے کی کوشش کی لیکن کہہ نہ سکا۔ اب تک وہ بات اس کے ذہن میں محفوظ تھی اور اس کے لبوں تک آنا چاہتی تھی لیکن زبان انھیں کسی نامعلوم وجہ سے بیان نہ کر سکتی تھی۔ اس کے ذہن کی یہ بات ایک ایسا راز تھی جس پر سے پردہ اُٹھ جانے کی کبھی بھی اُمید نہ کی جا سکتی تھی۔

ہوٹل ڈی پیلس کی پچھلی طرف کی کھڑکیوں میں اندر کے مناظر دیکھے جا سکتے تھے۔ جب کبھی موسلا دھار بارش ہو رہی ہوتی تھی تو اس فٹ پاتھ پر بیٹھ کر مانگنے والے سب بھکاری اپنی جھونپڑیوں

میں جا گھستے تھے۔ لیکن چانسو اپنی جگہ سے نہ ہلتا تھا۔ پچھلی جانب سے میونسپلٹی کی لالٹین لگی ہوئی تھی۔ یہی اسکا اڈا تھا۔ بلاناغہ شام کے وقت وہ اسی کھمبے کے قریب کھڑا ہو جاتا تھا۔ چپ چاپ، بلا کسی قسم کی حرکت کئے مٹی کے بت کی طرح۔ اس کی نظریں اندر کی طرف جمی ہوتی تھیں۔ اندر بجلی کی تیز روشنی میں اچھے اچھے کپڑے پہنے لوگ چہلیں کرتے پھرتے تھے۔ ان کی خدمت کرنے والے بیرے سفید وردیاں پہنے ہوئے سر پہ کلاہ والی پگڑیاں باندھے ادھر اُدھر گھوما کرتے تھے۔ ان کے کمر سے لپٹے ہوئے سبز رنگ کے پٹکے اور ان پر پیتل کے حروف ان کے لباس کی شان کو دو بالا کرتے تھے۔

آندھی ہو برسات ہو چانسو باہر اسی کھمبے کے پاس کھڑا رہتا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ آگے کو بڑھا رہتا تھا۔ لیکن اسے بڑھانا بھی یاد نہ رہتا تھا۔ بس وہ یونہی کھڑا ہو جاتا۔ لوگ اسکے قریب سے گذر جاتے تھے کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کیوں کھڑا ہوا اگر کبھی وہ ہاتھ بڑھا دیتا تو جب تک وہ اس جگہ کھڑا رہتا اس کا ہاتھ اسی قدر آگے بڑھا رہتا تھا۔ سکون اور بے حسی اس پر اس شدت سے طاری تھی کہ وہ گھنٹوں بلا حرکت کئے بیٹھا یا کھڑا رہ سکتا تھا۔

وہ نہ دعائیں دیتا تھا نہ منت کرتا تھا۔ بس اس کا ہاتھ آگے بڑھا رہتا جس سے معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ حاجت مند تھا۔ اپنے ساتھیوں کی طرح اسے آنے جانے والوں کی کامیابی، صحت یا

ان کے بچوں کی پرواہ نہ تھی۔ وہ مرے یا جئیں اس کی بلا سے۔
اسے بھوک محسوس ہوتی تھی۔ اس لئے وہ ہاتھ بڑھا دیتا تھا۔
لیکن اس کو بہت کم پیسے ملتے تھے۔ لوگوں کو اس کا پتہ ہی نہ چلتا۔
تھا۔ انھیں اسکے وجود کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ بعض اوقات
جب اسے بہت شدت کی بھوک لگی ہوئی ہوتی تھی۔ اور اسی طرح
کھڑے کھڑے بہت زیادہ وقت بیت جاتا تو بعض اوقات وہ
کسی بابو کو دیکھ کر خفیف سا آگے کو جھکتا۔ اس کے ہونٹ سمٹ
جاتے اور پھر اس کی صورت سے یوں دکھائی دیتا کہ اب وہ اس
بابو کو کچھ کہے گا۔ کوئی بڑی زوردار بات اچھل کر اس کے لبوں سے
باہر نکل جائے گی۔ یہ کیفیت بہت ہی شدید صورت اختیار کر
لیتی۔ لیکن نتیجہ وہی نکلتا کہ وہ خاموش کا خاموش رہتا۔........
جیسے کسی غیر معمولی طاقت کے زیر اثر اس کی زبان کی قوت زائل
ہو گئی ہو۔

اس بستی سے دو فرلانگ پرے سکھوں کا ایک بہت بڑا
گوردوارہ بھی تھا۔ جس کی پرشکوہ عمارت پر جسقدر روپیہ
خرچ آیا تھا اس رقم کے دس ہزارویں حصہ سے اتنی افیون
خریدی جا سکتی تھی جس سے ان سب بھکاریوں کا صفایا کیا
جا سکتا تھا۔ بڑے بڑے امیر سکھ اور عورتیں اور مرد قیمتی
کپڑے زیب تن کئے اس غلیظ بستی میں سے صحیح سالم نکل کر گورو
گرنتھ کے چرنوں تک جا پہونچتے تھے خواہ ادھر سے متبرک گورو
گرنتھ صاحب کی روح اپنے ان غلیظ اور کچلے ہوئے ہندوں کی

بستی پر منڈلاتی پھرتی ہو۔ بارہا وہ لوگ باجے اور ڈھلکیاں بجاتے اور شبد گاتے ادھر سے گذر جاتے۔ اور چانسو گرنتھ صاحب کو دیکھتا تو یکایک پھر اس کے منہ کی وہی صورت ہو جاتی جیسے وہ کوئی بات کہنے کو ہے لیکن وہ کچھ نہ کہہ پاتا —— وہ تاریکی میں بھٹکتے ہوئے شخص کی طرح ادھر ادھر دیکھتا لیکن اس کے بشرے سے یہی ظاہر ہوتا جیسے اسے کچھ بھی نہیں دکھائی دیتا۔

بعض اوقات فرزندان اسلام بھی جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے ادھر سے گذرتے تھے۔ اس وقت وہ عموماً صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوتے تھے۔ بعض ان میں غریب بھی ہوتے تھے۔ بعض بڑے بڑے خان ہوتے تھے۔ جن کے طرے ہوا میں لہراتے تھے۔ اور جن کی نظریں بلند ہوتی تھیں۔ وہ سینہ تان کر اور سر بلند کر کے چلتے تھے۔ اس وقت چانسو ہاتھ پھیلا کر ان کے رستہ میں کھڑا ہو جاتا تھا۔ وہ ہجوم خدا کے گھر کی طرف بڑھتا چلا جاتا تھا۔ خدا کے بندوں کے طرف دھیان دینے کا انھیں خیال ہی نہ آتا تھا یا اس کی ضرورت ہی نہ سمجھتے تھے۔ جب ہجوم گذر جاتا تو ان کے پیچھے اڑتی ہوئی گرد چانسو کے حصے میں آتی تھی۔ اور وہ وہاں سے ہرگز نہ ٹلتا تھا جب تک کہ ان کے پیروں سے اڑی ہوئی ساری گرد سے اس کا چہرہ، بال، بھنویں اٹ نہ جاتی تھیں۔ وہ وہاں بت بنا کھڑا رہتا جیسے وہ چپ چاپ صدائے احتجاج بلند کر رہا ہو۔ لیکن اس کی آواز کوئی شخص نہ سن سکتا۔ اس کا چہرہ عام طور پر جذبات سے عاری ہوتا تھا۔ اس طرح تیز دھوپ میں

کھڑے کھڑے وہ اپنا ہاتھ آگے بڑھائے رکھتا۔ شاید یہ عالم تصور میں وہ اب بھی ایک جم غفیر اپنے سامنے سے گذرتا ہوا دیکھ سکتا تھا۔ یا شاید اسے انسانوں کی بخشش کی اتنی پرواہ بھی نہ تھی۔ شاید آسمان سے کسی چیز کے ٹپک پڑنے کی اُمید تھی۔ لیکن جو کچھ بھی وہ سوچتا ہو۔ وہ کبھی کبھی سانس لیتے ہوئے جاندار سے اکدم پتھر میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جھونپڑی میں سے بیوہ کا لڑکا باہر نکل آتا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر لے جاتا۔

اُس کھلے میدان میں بڑے بھاری بھاری جلسے منعقد ہوتے تھے۔ کبھی وہاں ترکی ٹوپیوں کے پھندنے ہوا میں اڑتے دکھائی دیتے تھے۔ اور "اللہ ہو اکبر" کی صدائیں بلند ہوتی تھیں۔ کبھی کرپانوں کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ اور گرجدار آوازیں بلند بول سُنائی دینے لگتے تھے۔ لیکن ان جھونپڑیوں کی دُنیا میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا نہ ہوتی۔ وہ لوگ سب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی ان سے کوسوں دور رہتے تھے۔

رات کے وقت ادھر سے گذرنا خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ اونچے مکانوں کے رہنے والوں کا خیال تھا کہ اس علاقے میں شہر بھر کے بڑے بڑے جرائم پیشہ لوگ رہتے تھے۔ امریکہ سے آئے ہوئے سپاہی یا غیر ممالک سے آئے ہوئے سیاح جب رات کو سنیما ہاؤس یا ناچ گھر میں وقت گذارنے کے بعد ادھر سے گذرتے تھے۔ تو گوبر کے ڈھیروں کی طرح دکھائی دینے والی

ان جھونپڑیوں اور رات کی تاریکی میں چھچھوندروں کی طرح چھپ چھپ کر چلنے اور دیدے چمکانے والی ان کالی کالی صورتوں کو دیکھ کر سمجھتے تھے کہ اس وقت وہ "پراسرار شرق" (The Mysterions East) میں گھوم رہے ہیں اور پھر واپس جاکر وہ اپنے ہم وطنوں کو اس جگہ کے قصّے سُناتے تھے کہ ایک روز رات کے وقت انھیں کسی پراسرار جگہ میں سے ہو کر گذرنا پڑا جہاں غلیظ انسان جانوروں سے بدتر زندگی بسر کرتے تھے۔ اور پھر وہ ان بھوکے اور ننگے انسانوں کے گھناؤنے پن کا ذکر کرتے تھے۔

ایک رات گیارہ بجے کے قریب جب کہ چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ چانسو آوارہ گھومنے کے بعد جھونپڑیوں کی طرف آرہا تھا۔ جب وہ گندہ نالے کے بوسیدہ اور چرچراتے ہوئے پل سے گذرا۔ تو اس نے دیکھا کہ کالی کالی جھونپڑیوں سے پرے ڈی پیلیس کی چھت پر کچھ روشنی سی ہو رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا آج چونکہ موسم خوشگوار تھا اس لئے رقص و سرود کی محفل ہوٹل کی چھت پر منعقد کی گئی تھی ....

.... وہ چھت کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا اور شکست قدموں سے اپنی جھونپڑی کی طرف بڑھنے لگا۔

اس کی جھونپڑی کے قریب اس بیوہ کی جھونپڑی تھی جس نے رحم کھا کر اسے بھی ایک جھونپڑی کھڑی کر دی تھی۔

بیوہ کا دس گیارہ برس کا لڑکا اس وقت ماں سے جھگڑ

رہا تھا۔

ہوٹل ڈی پیلیس پر وقتاً فوقتاً آتشبازی کا تماشہ بھی دکھائی دیتا تھا۔ کبھی ایک انار پھوٹ کر اس میں سے رنگین چنگاریاں پانی کی بوچھاڑ یا فوارے کی طرح ادھر کو اٹھ کر نیچے گرتی بہت دلفریب معلوم ہوتی تھیں۔ لڑکا اپنی ماں سے ضد کر رہا تھا کہ وہ اسے بھی کہیں سے آتشبازی کے انار لا کر دے۔ بیوہ حیران تھی کہ وہ انار کہاں سے لائے۔ ان دونوں میں کتنی ہی دیر تک جھگڑا ہوتا رہا۔ اور جب چانسو اپنی جھونپڑی میں گھس بیٹھا۔ تو اسے ان دونوں کی کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی آواز سنائی دیتی رہی۔ آخر ماں نے ہار مان لی۔ وہ انار لانے کے بہانے سے اپنی جھونپڑی سے باہر نکلی اور دبے پاؤں چانسو کی جھونپڑی کے قریب دبک کر بیٹھ گئی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ لڑکا کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد سو جائے گا اور پھر وہ بھی اندر جا کر پڑ رہے گی۔

چانسو کے کانوں تک ان دونوں کی آوازیں پہنچتی رہی تھیں۔ جھونپڑی کے اندر برائے نام ہی روشنی تھی۔ وہ اسی طرح تاریکی میں بیٹھا آنکھیں جھپکا رہا تھا۔ ان عجیب وغریب انسانوں کی بستی میں اسکا وجود ایک معمہ سے کم نہ تھا۔ اس کا بے حس اور جذبات سے خالی چہرہ اس وقت کسی درندے سے مشابہ تھا........... اس نے جھونپڑی کے دروازے میں سے دیکھا کہ لڑکا دبے پاؤں ہوٹل ڈی پیلیس کی طرف بڑھ

رہا ہے ..... دفعتاً وہ بھی چپکے سے چوپائے کی طرح چلتا ہوا
جھونپڑی سے باہر نکلا۔ اور لڑکے کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

لڑکا ہوٹل کے پچھواڑے ایک دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا
ہوگیا اور منہ اٹھا کر ہوٹل کی چھت کی طرف دیکھنے لگا۔

چھت پر رنگ برنگ کی روشنی ہو رہی تھی۔ نیلاہی مائل
آسمان اور زرد رو تاروں کا پس منظر رنگوں اور ادھر پیلے سبز
اور سُرخ رنگوں کی روشنی اوپر کی جانب پھیل کر تاریکی میں گھل
مل گئی تھی۔ نیچے سے سوائے روشنی کے کچھ دکھائی نہ دیتا
تھا۔ البتہ رسیلے سازوں کی آواز اور گھنگروؤں کی جھنکار سنائی
دے رہی تھی یا کبھی رقص کرتی ہوئی نوخیز عورتوں کی کلائیاں
اور کنول سے ہاتھ چشم زدن میں ادھر سے ادھر گھوم کر غائب
ہو جاتے جیسے بجلی چمک جائے۔ غالباً ایک سے زیادہ عورتیں
رقص کرتی ہوئی اِدھر اُدھر چکر لگا رہی تھیں۔ ان کے ہوا میں
اڑتے ہوئے ارغوانی، دھانی، اور ہلکے زرد اور سُرخ رنگ
کے دوپٹے لہریں لیتے ہوئے رنگین ساریوں کی طرح دکھائی
دیتے تھے۔

جب چانسو لڑکے کے قریب پہونچا تو لڑکے نے چونک کر ایک
لمحہ کے لئے اس پر نگاہ ڈالی اور اسے پہچان کر اطمینان سے پھر
اوپر کی جانب دیکھنے لگا۔ ہلکی روشنی میں اس کے طفلانہ چہرے
سے کس قدر اشتیاق ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کی ناک پر کہیں سے
تھوڑی مٹی لگ گئی تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے کھڑا

تھا۔ اُس کی اوپر کو اُٹھی ہوئی ٹھوڑی کے نیچے اس کی نرم مٹیالی گردن پر جس جگہ بل پڑتے تھے وہاں میل جم کر تین چار ہلکے ہلکے خطوط بن گئے تھے۔

چانسو اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ جب پھر انار چھوٹے تو لڑکے نے چانسو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسرت سے چلّا کر کہا "وہ دیکھو ..... آہا کیسی روشنی ہو رہی ہے"

چانسو کے لبوں پر مسکراہٹ آتے آتے رہ گئی ..... وہ لڑکے کی طرف بڑی رحم بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ اور اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ...... اور لڑکے کی نرم و نازک گردن ٹٹول کر ہاتھ میں پکڑ لی .... پھر اس کی گرفت تنگ ہونے لگی .... ایک مہیب چیخ لڑکے کے حلق میں سے نکلی .... لیکن پھر وہ بول نہیں سکا .... کشمکش کرتا رہا ...... چانسو کی غیر معمولی طور پر باہر نکلی ہوئی آنکھیں درست حالت میں آنے لگیں .... لڑکے کی ماں بھاگی بھاگی آئی .... اس نے دیکھا کہ چانسو روشنی کی طرف دیکھ رہا ہے .... اس کے منہ کی بناوٹ ایک مرتبہ پھر ایسی ہو گئی جیسے وہ کوئی بڑی اہم بات کہنے کو ہو .... لفظ اس کے منہ سے نکل کر فضا میں پھیل گئے "روشنی! .... روشنی ... دیکھو روشنی!"

خون! ... خون!!

روشنی! ... روشنی!!

بھینک

ہمارے شہر کے جس چوک میں حلوائیوں کی دکانیں ہیں وہاں صبح و شام لسی اور دودھ پینے والوں کا تانتا سا بندھا رہتا ہے۔
گرمیوں کے دنوں میں لسی کی زیادہ کھپت ہوتی ہے۔ سردیوں میں لوگ لسی پیتے ہیں لیکن کم۔ لسی کے ساتھ دودھ اور چائے کا سلسلہ بھی جاری ہو جاتا ہے۔
ادھر صبح ہوئی حلوائی نے جبوترا دھلوا ڈالا۔ ایک طرف بھٹی پر دودھ کا بڑا کڑھاؤ رکھ دیا جاتا ہے۔ دکان کے درمیانی حصّہ میں خود نانبائی جو ایک بھاری بھرکم شخص ہے۔ ایک بڑی سی چوکی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے سر کے بال مشین سے کٹے ہوئے ہوتے تھے۔ اس کی سیاہ بڑی بڑی مونچھیں ہیں۔ رنگ گورا۔ اس قدر موٹاپے کے باوجود وہ اس طرح آلتی پالتی

مار کر کیونکر بیٹھ جاتا ہے یہ ایک راز ہے جو دیکھنے والے کی فہم سے بعید ہے ـــ اس کے ارد گرد اس کے نوکر جو دہی بلونے کا کام انجام دیتے ہیں اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے سوتے ہیں۔ یہ لوگ بھی عموماً اپنے لالہ کی طرح موٹے اور بھدے ہوتے ہیں لیکن ذرا چھوٹے پیمانے پر۔ وہ لالہ کے نزدیکی یا دور کے رشتہ دار بھی نہیں ہوتے لیکن اس کے باوجود وہ موٹاپے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ ان کی ٹھڈیوں کے نیچے کا گوشت قدرے لٹکتا ہوا سا دکھائی دیتا ہے۔ گال بھی پھلاؤ کی طرف راغب ہوتے ہیں پیٹ بھی اختیار سے باہر ہو جاتا ہے۔ غالباً یہ اس لئے ہوتا ہوگا کہ وہ سارا سارا دن لالہ کے قریب بیٹھے رہتے ہیں ـــ اور خربوزے کو دیکھکر خربوزہ رنگ پکڑتا ہی ہے۔

بڑا لالہ عموماً یا تو اپنی رانیں سہلایا کرتا ہے یا وہ بیٹھا بیٹھا اپنے ایک پاؤں کو دبایا کرتا ہے۔ اور دس دس پندرہ پندرہ منٹ کے وقفہ پر زور سے کھانس کر تولہ بھر بلغم اپنے قریب ہی ایک کونے میں دے مارتا ہے۔ وہ اپنی سست آنکھوں سے آنے جانے والوں پر نگاہ رکھتا ہے بس وہاں گاہکوں کی اتنی بھرمار ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص بلا پیسے ادا کئے وہاں سے کھسکنا چاہے تو اسے پتہ نہیں چل سکتا۔ دراصل اس کا ایک ہی کام ہے روپیہ بٹورنا۔ لوگ دودھ یا لسی پی کر دام اس کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ اکنیاں، دوانیاں، چونیاں اور اٹھنیاں وغیرہ وہ اپنے سامنے رکھے ہوئے بڑے سے تھال میں پھینکتا دیتا اور

نوٹ وغیرہ رکھنے کے لئے اس کے پہلو میں لوہے کی ایک صندوقچی پڑی رہتی ہے۔ اس میں چابی لگتی ہے۔ چابی کے ساتھ باریک تاگا بندھا ہوتا ہے جس کے دوسرے سرے پر اس کے کان کریدنے کی چمچی اور دانت کریدنے کی پن سی بندھی ہوتی ہے جس وقت وہ نوکروں کو گالیاں نہیں دے رہا ہوتا یا جب وہ اونگھتا نہیں نہیں ہوتا اسوقت وہ یا اپنے کانوں کی میل نکالنے میں مصروف رہتا ہے یا دانت کریدنے لگتا ہے۔

گاہک تو خیر دودھ یا لسی پینے کے لئے جمع ہوتے ہی ہیں ان کے ساتھ بھکاری بھی آن دھمکتے ہیں۔ اِدھر کسی شخص نے منہ سے دودھ کا گلاس لگایا ادھر اس کے کانوں میں مکھی کی سی بھنک کی طرح ایک آواز متاثر "بھوکی ہوں بابا ... تمہاری گدی بنی رہے۔ تمھیں پرماتما بہت بہت دے .... میں نے کئی دنوں سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا بابا"

جب دودھ پینے والا کچھ دم لینے کے لئے گلاس سے منہ ذرا پرے کو ہٹا لیتا ہے۔ تو وہ سوکھی غلیظ بھکارن اس کے قریب چلی آتی ہے۔ اس کے متعفن کپڑوں سے بدبو نکل نکل اسکے نتھنوں میں گھسنے لگتی ہے بھکارن بڑی بھوکی نظروں سے اس کے ہونٹوں کی طرف دیکھنے لگتی جو ابھی دودھ ہی میں تر ہوتے ہیں۔ پھر دفعتاً وہ ہونٹ رومال سے پونچھ ڈالے جاتے ہیں۔

نانبائی کی طرف سے ان باتوں کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ البتہ دکان کے اندر کرسیاں پڑی ہوتی ہیں اگر گاہک چاہیں تو

ان پر بیٹھ کر آرام سے کھا پی سکتے ہیں کیونکہ وہاں بھکاریوں کے پہنچنے کا احتمال نہیں ہو سکتا لیکن عام طور پر لوگ بہت جلدی میں ہوتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ کھڑے کھڑے پئیں اور پھر فوراً اپنے کام پر بھاگ جائیں۔ ایک سبب اور بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ جو لوگ باہر کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ بار بار تقاضہ کر کے چیز جلد حاصل کر لیتے ہیں اور جو بیچارے اندر کرسیوں پر جا بیٹھتے ہیں وہ بیٹھے کے بیٹھے رہ جاتے ہیں —— غرض لالہ نے گاہکوں کے لئے جو کچھ اس کے امکان میں تھا کیا۔ اب گاہکوں کو پوری آزادی حاصل تھی کہ وہ جس طرح چاہیں عمل کریں۔

دُوکان پر جانے والے آدمیوں اور بھکاریوں کو یہ کشمکش بھی بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔ بھکاری نفسیات کے اُستاد ہوتے ہیں۔ فرائڈ، ایڈلر، ژنگ وغیرہ نفسیات کی مسائل کو خواہ کہیں سے کہیں پہنچا دیں لیکن انسان عام طور پر انھیں پڑھے بغیر بھی نفسیات کے کارآمد اور عملی پہلوؤں کو وجدانی طور پر سمجھ لیتے ہیں اور ان سے پورا پورا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ ہمارے نانبائی کی دُوکان پر جمع ہونے والے بھکاری اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب لوگ کچھ کھا رہے ہوں تو وہ یہ پسند نہیں کرتے کہ کوئی بھوکی نظروں سے ان کی طرف دیکھے۔ اس کی بھی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو اس وقت ایک انسان خود اپنی بھوک یا پیاس مٹانے کے لئے دوکان پر جا کھڑا ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر اسے بھوک یا پیاس کا بہت ہی شدید احساس ہوتا ہے۔ اس وقت اگر کوئی کہے کہ میں بھوکا ہوں تو اُسے

اس کا مطلب سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی ۔ اور وہ دوسرے کی بھوک مٹانے کے لئے بھی کچھ نہ کچھ قربانی کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے ۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ جب انسان کچھ کھا رہا ہو تو ایسے موقع پر گندی چیز دیکھنے یا سننے کو جی نہیں چاہتا ۔ کھاتے پیتے وقت وہ کبھی غلاظت کا نام نہ لے گا ۔ نہ اس کا ذکر سننا پسند کرے گا ۔ بلکہ یہاں تک کہ ان کی طبیعت ہر طرح سے مطمئن اور مسرور نہ ہو تو وہ اچھی طرح کھانا کھا ہی نہیں سکتا ۔ اپنی طبیعت کو مسرور رکھنے کے لئے انسان کھانے کی جگہ نہ صرف صاف ستھری رکھتا ہے بلکہ میز پر پھولوں کے گلدستوں کا اہتمام بھی کرتا ہے ۔ اب اگر کچھ کھاتے وقت غلیظ لالچی صورت سامنے آ کھڑی ہو تو انسان کے لئے ایک نوالہ تک نگلنا دشوار ہو جاتا ہے یہی نہیں بلکہ جب تک گاہک دوکان پر کھڑا دودھ پیتا رہے بھکاری قریب کھڑے منتیں کئے جاتے تھے .... اس کے علاوہ ہندوستانی وہمی بھی ہوتے ہیں ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح نظر لگ جاتی ہے ۔ کھایا پیا بجائے ہضم ہو کر جزو بدن بننے کے الٹا نقصان کرتا ہے اس لئے وہ جلد از جلد کچھ دے دلا کر بھکاریوں سے جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ بھکاری ان سب باتوں کا خوب سمجھتے ہیں ۔ اور وہ ان کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں ۔

موقع و محل کو سمجھنے میں بھکاری انتہائی قابلیت کا ثبوت دیتے ہیں ۔ اس کے علاوہ وہ انسان کی باقی کمزوریوں سے بھی خوب اچھی طرح واقف ہوتے ہیں ۔ انھیں بے شمار دعائیں بھی

یاد ہوتی ہیں۔ ان میں بعض بھکاری توان دعاؤں کو بڑی احتیاط سے استعمال کرتے ہیں وہ اپنے شکار کو دیکھ لیتے ہیں کہ اسے کس دعا کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً عورتوں کو تو بچوں کی دعائیں ضرور ہی دیں گے۔ عورتوں کی یہ رگ بہت کمزور ہوتی ہے جہاں کسی فقیر نے منمنا کر اس کے بچوں کی درازئ حیات کی دعا کی تو وہ فوراً پگھل جاتی ہیں جھٹ گانٹھ سے پیسہ کھول کر ان کے ہاتھ پر رکھ دیتی ہیں۔ بچاری عورت! عورتوں کے خاوندوں کو دعائیں دینا بھی اسی قدر زود اثر گر ہے۔ "بی بی تیرا سہاگ بنا رہے" اس پر ہندوستانی عورت پھول کر کپا ہو جاتی ہے۔ خاوند خواہ چور، شرابی، رنڈی باز، جو کچھ بھی ہو اس کی سلامتی بہر صورت منظور ہے۔ اس کی سلامتی نہ مانگی جائے تو عورت کی زندگی مصائب میں گرفتار ہو جاتی ہے کہ ساری عمر بیکار گذر جاتی ہے۔ اس لئے عورت کو خاوند کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ خاوند ہو تو بچوں کی بھی کچھ کمی نہیں ہو سکتی۔

عورتیں بھکاریوں کا سب سے آسان شکار ہیں۔ لیکن مردوں کو پھانسنے میں بھی وہ کچھ کم ہوشیار نہیں ہوتے۔ مثلاً اگر وہ کسی نئے جوڑے کو گھومتے ہوئے دیکھ پائیں تو فوراً قریب پہنچ کر کہہ دیں گے۔ "تمہاری جوڑی سدا بنی رہے" — عموماً مرد کو اپنی نئی دلہن بہت پیاری ہوتی ہے۔ اگر کوئی ایک مرتبہ بھی ان کے حق میں دعائے خیر کر دے تو فوراً ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ جھٹ ہاتھ پتلون کی جیب میں جا گھستا ہے۔

پنجاب میں مردوں کو جوانی پر ناز ہوتا ہے کسی کو "پہلوان" کہہ کر مخاطب کرنا آدھی جنگ جیت لینے کے برابر ہے - اپنی اسی کمزوری کو پنجاب والے خوب سمجھتے ہیں اور وہ اسی حربہ کو بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں - مثلاً تانگے والا جا رہا ہو راستے میں خواہ یونہی دبلا پتلا آدمی کھڑا ہو اور تانگے والا اسے دھتکارنا بھی چاہتا ہو اور لڑائی مول لینے سے بھی کتراتا ہو تو جھٹ کہہ دے گا "ابے ہٹ پہلوان! بیچ سڑک کے ایسے کھڑا ہے جیسے اپنے گھر کی سڑک ہو"

اگر وہ پہلوان کا لفظ استعمال نہ کرتا تو اسی بات پر تو تو میں میں ہو سکتی تھی - لیکن صرف ایک لفظ "پہلوان" سے سڑک کے بیچ میں کھڑے ہونے والے کا دل اس قدر مسرور ہو جاتا ہے کہ وہ دو چار گالیاں کھا کر بھی خفا نہیں ہوتا - اسی طرح جوان کہلوانا بھی فخر کا باعث سمجھا جاتا ہے - اگر کوئی جوانی کی دعا دے تو کیا کہنے - جوان کچھ نہ کچھ دے ہی بیٹھتا ہے - "تمہاری جوانی صدا بنی رہے" - اب سننے والا جوان ہو یا نہ ہو وہ اس بات پر پھولا نہیں سماتا - بعض اچھے خاصے ادھیڑ آدمی بھی اس جھانسے میں آ جاتے ہیں - انھیں محسوس ہوتا ہے کہ جو کچھ ان کا آئینہ انھیں بتاتا ہے وہ سب جھوٹ ہوتا ہے - درحقیقت اس کی صورت سے بڑھاپے کے آثار ظاہر نہیں ہوتے ورنہ یہ فقیر مجھے ایسی دعا ہی کیوں دیتا —— وہ سیانے فقیر کی ذہانت اور دور اندیشی سے واقف ہی نہیں ہوتا -

اسی طرح روپئے کا خمار بھی بہت زبردست شے ہے۔ دولت کا ہاتھ آنا اس دنیا میں ہر چیز کی ضرورت پوری کرتا ہے یہاں تک کہ خدا کی مدد سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ جب دولت مند شخص خوب اینٹھتا ہوا بازار میں سے چلا جا رہا ہو۔ تو اسے کوئی فقیر آگے بڑھکر کہہ دیتا ہے "تیری گدّی بنی رہے"۔ تو اسکی خوشی کی انتہا نہیں رہتی گو وہ ان باتوں کو چہرے سے ظاہر بھی نہیں ہونے دیتا شاید پہلی مرتبہ کی دُعا کے فوراً بعد وہ پیسہ نکالکر بھی نہیں دیتا۔ لیکن فقیروں کے پلّے سے کچھ نہیں جاتا وہ زبان ہلا دیتے ہیں۔ اور سننے والے سمجھتے ہیں کہ اِدھر فقیر نے کچھ کہا اور اُدھر اُس کی صدا عرش پہ جا پہنچی آخر وہ سیٹھ صاحب کچھ نہ کچھ دے بیٹھتے ہیں۔ ایک دو پیسوں میں ایسی شاندار دُعائیں لوٹ نہیں تو پھر کیا ہے۔

اب تک تو ان بھکاریوں کا ذکر تھا جو واقعی عقلمند ہیں اور موقع محل نیز دعاؤں کے مناسب استعمال سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں ان گھڑ ریوں کی بھی کچھ کمی نہیں جو دعاؤں کا بہت بے تکا استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے دعاؤں کا بغور مطالعہ نہیں کیا ہوتا۔ یونہی سنی سُنائی دعائیں یاد کر لیتے ہیں۔ اور پھر جب کسی شخص کو دیکھ پاتے ہیں تو دھڑ دھڑ دُعائیں دینے لگتے ہیں۔ بچّوں کے جیتے رہنے سے لے کر گدّی بنی رہنے تک سب دعائیں یکے بعد دیگرے دے ڈالتے ہیں اگر کوئی نشانے پہ بیٹھ جائے تو بہتر ورنہ منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔

بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں جنھیں بچوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ابھی تک وہ اس جذبہ سے خالی ہوتے ہیں۔ نہ ان کے پاس بچے پیدا کرنے کی مشین ہوتی ہے یعنی بیوی اور نہ اتنی توفیق ہی ہوتی ہے کہ شادی کر لیں۔ ان لوگوں کو بچوں کی دعائیں دینا وقت ضایع کرنا ہے۔ اور بعض تو اس قسم کی باتوں سے جھلا جاتے ہیں کہ بھکاری کو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ تو خود ہی ابھی بچے ہیں۔ ان کے بچوں کا تو خیر سوال ہی کیا ہے۔ بعض کو بہت تاؤ آتا ہے تو کہہ دیتے ہیں "ہٹ مائی! کوئی نہیں بچہ وچہ ...."

تب مائی کو پتہ چلتا ہے کہ اس نے اصل غلطی کیا ہوئی۔ اور وہ بیچاری حیران رہ جاتی ہے کہ اسے کونسی دعا دوں۔ دراصل لوگوں کو اس بات پہ طیش نہیں آنا چاہیئے۔

بچے کے علاوہ بعض کلرکوں یا اسی قسم کے بابوؤں کو بھی بھکاری غلط دعائیں دے ڈالتے ہیں۔ مثلاً "تیری گدی بنی رہے"۔ سننے والا بیچارا حیران ہوتا ہے کہ گدی کیسی۔ وہ سارا سارا دن دفتر میں قلم گھسنے اور افسروں کی گھڑکیاں اور دھمکیاں سننے کے بعد کہیں دال روٹی کھا پاتا ہے اور یہ بڑھیا کہتی ہے تیری گدی بنی رہے۔ وہ بیچارا پہلے ہی پریشان ہوتا ہے اسی قسم کی دعائیں ایسی محسوس ہوتی ہیں جیسے وہ بڑھیا اس کا منہ چڑھا رہی ہو ایسے بھکاریوں کو عام طور پہ گالی سننی پڑتی ہے۔

ہمارے نانبائی کی دوکان محض دودھ لسی کی دوکان نہیں بلکہ یہاں پر ہندوستان بھر کے قسم قسم کے بھکاری بھی دیکھے

جا سکتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کے ہتھکنڈے واقعی بہت موثر ہیں لیکن ان بھکاریوں کے لئے جو محض دعاؤں پر انحصار رکھتے ہیں باقاعدہ تعلیم وتربیت کا انتظام ہونا چاہیئے۔ عقل وذہانت کی تو ان میں کوئی کمی نہیں ہوتی صرف تنظیم اور تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کو موقع ومحل کے مطابق دعائیں دینے کا سلیقہ سکھایا جانا چاہیئے مثلاً کوئی لڑکا امتحان دے کر آیا ہو تو ظاہر ہے اسے زیادہ تر اسی بات کی تشویش ہوگی اگر اس وقت کوئی چرب زبان فقیر یہ دعا دے "اللہ تعالیٰ تجھے امتحان میں پاس کر دے" تو یہ لازمی بات ہے طالبعلم ضرور اسے کچھ نہ کچھ دے ڈالے گا۔ اس کو اور زیادہ تفصیل کے ساتھ سیکھا جا سکتا ہے۔ بھکاریوں کی تنظیم کر کے اس قسم کے شکار تاڑ لئے جائیں۔ اگر کوئی شخص کسی نوکری کے سلسلہ میں انٹرویو کر کے آیا ہو تو اسے دعا دی جائے کہ اللہ تجھے انٹرویو میں کامیاب کرے۔ اگر کوئی شخص کسی جگہ کو جا رہا ہو اور گاڑی چھوٹنے والی ہو تو اس کے لئے دعا کی جائے خدا کرے تیری گاڑی تجھے مل جائے۔ اگر کوئی شخص گھر کی طرف لپکا جا رہا ہو بادل گھر آئے ہوں بارش کا خطرہ ہو تو اسے دُعا دی جائے کہ پرمیشور کرے تو بارش ہونے سے پہلے گھر پہنچ جائے۔ یا گھر پہنچنے سے پہلے پہلے بارش نہ ہو۔ اس قسم کی ہزاروں باتیں ہو سکتی ہیں جن میں دعاؤں سے کام لے کر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

یہ تو عام قسم کے بھکاری ہیں جو ہمارے نانبائی کی دکان پر

ھڑے رہتے ہیں اور عام طور پر نظر آ جاتے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ
اس قسم کے بھکاری بھی ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً ایک نہایت مکروہ صورت
کاری کے بھیک مانگنے کا طریقہ سب سے نرالا ہے۔ اس کا رنگ
سڑے چمڑے کی مانند بھدا ہے۔ اس کی ناک بیٹھی ہوئی ہے۔
انت آگے کو نکلے ہوئے اور بہت زیادہ غلیظ۔ وہ چیتھڑے سے
کائے رہتا ہے جن میں سے بہت سخت بو ہر طرف پھیلتی رہتی
ہے ۔اس کے چہرے پر پسینہ کی بوندیں جھلکتی رہتی ہیں۔ پسینہ
ے ساتھ اس کے چہرے پر خاص قسم کی چکناہٹ بھی ملی ہوئی دکھائی
یتی ہے۔ وہ اس قدر گھناؤنا شخص ہے کہ انسان کا اس کی طرف
یکھنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ اس کا خیرات مانگنے کا طریقہ یہ ہے
۔وہ بغیر منہ سے آواز نکالے چپ چاپ کسی شخص کے سامنے دفعتاً
ی جا کھڑا ہوتا ہے اور پھر بڑھ کر بہت قریب چلا جاتا ہے اسکا
نہ بھی انسان کے منہ کے بالکل قریب پہنچ جاتا ہے یہاں تک کہ
س کے دبے ہوئے نتھنوں میں سے نکلتی ہوئی ہوا ان کے چہرے
چھوتی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہے وہ منہ سے کچھ نہیں کہتا بلکہ
ی دیدہ دلیری کے ساتھ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہاتھ آگے
ھا دیتا ہے۔ ایسے موقع پر اس کے ہاتھ پر کچھ نہ کچھ رکھے بغیر جان
یں چھوٹتی۔ بلکہ اور کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ اس سے اس قدر زیادہ
ن آتی ہے کہ انسان اسے دھکا دے کر پرے بھی نہیں ہٹا سکتا۔
آنکھوں دیکھی بات ہے کہ ایک مرتبہ وہ کسی شخص کے سامنے
سب عادت دفعتاً ہی جا کھڑا ہوا۔ اس آدمی کو اس کی اس حرکت

اسی طرح روپئے کا خمار بھی بہت زبردست شے ہے۔ دولت کا ہاتھ آنا اس دنیا میں ہر چیز کی ضرورت پوری کرتا ہے یہاں تک کہ خدا کی مدد سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ جب دولت مند شخص خوب اینٹھتا ہوا بازار میں سے چلا جا رہا ہو۔ تو اسے کوئی فقیر آگے بڑھکر کہہ دیتا ہے "تیری گدی بنی رہے" تو اسکی خوشی کی انتہا نہیں رہتی گو وہ ان باتوں کو چہرے سے ظاہر بھی نہیں ہونے دیتا شاید پہلی مرتبہ کی دعا کے فوراً بعد وہ پیسہ نکالکر بھی نہیں دیتا۔ لیکن فقیروں کے پلے سے کچھ نہیں جاتا وہ زبان ہلا دیتے ہیں۔ اور سننے والے سمجھتے ہیں کہ اِدھر فقیر نے کچھ کہا اور اُدھر اُس کی صدا عرش پر جا پہنچی آخر وہ سیٹھ صاحب کچھ نہ کچھ دے بیٹھتے ہیں۔ ایک دو پیسوں میں ایسی شاندار دعائیں لوٹ نہیں تو پھر کیا ہے۔

اب تک تو ان بھکاریوں کا ذکر تھا جو واقعی عقلمند ہیں اور موقع محل نیز دعاؤں کے مناسب استعمال سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں ان گھامڑریوں کی بھی کچھ کمی نہیں جو دعاؤں کا بہت بے تکا استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے دعاؤں کا بغور مطالعہ نہیں کیا ہوتا۔ یونہی سنی سنائی دعائیں یاد کر لیتے ہیں۔ اور پھر جب کسی شخص کو دیکھ پاتے ہیں تو دھڑ دھڑ دعائیں دینے لگتے ہیں۔ بچوں کے جیتے رہنے سے لے کر گدی بنی رہنے تک سب دعائیں یکے بعد دیگرے دے ڈالتے ہیں اگر کوئی نشانے پر بیٹھ جائے تو بہتر ورنہ منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔

بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں جنھیں بچوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ابھی تک وہ اس جذبہ سے خالی ہوتے ہیں۔ نہ ان کے پاس بچے پیدا کرنے کی مشین ہوتی ہے یعنی بیوی اور نہ اتنی توفیق ہی ہوتی ہے کہ شادی کر لیں۔ ان لوگوں کو بچوں کی دعائیں دینا وقت ضایع کرنا ہے۔ اور بعض تو اس قسم کی باتوں سے جھلا جاتے ہیں کہ بھکارن کو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ تو خود ہی ابھی بچے ہیں۔ ان کے بچوں کا تو خیر سوال ہی کیا ہے۔ بعض کو بہت تاؤ آتا ہے تو کہہ دیتے ہیں "ہٹ مائی! کوئی نہیں بچہ وچہ ...."

تب مائی کو پتہ چلتا ہے کہ اس سے اصل غلطی کیا ہوئی۔ اور وہ بیچاری حیران رہ جاتی ہے کہ اسے کونسی دعا دوں۔ دراصل لوگوں کو اس بات پر طیش نہیں آنا چاہیئے۔

بچے کے علاوہ بعض کلرکوں یا اسی قسم کے بابوؤں کو بھی بھکاری غلط دعائیں دے ڈالتے ہیں۔ مثلاً "تیری گدی بنی رہے"۔ سننے والا بیچارا حیران ہوتا ہے کہ گدی کیسی۔ وہ سارا سارا دن دفتر میں قلم گھسنے اور افسروں کی گھڑکیاں اور دھمکیاں سننے کے بعد کہیں دال روٹی کھاپاتا ہے اور یہ بڑھیا کہتی ہے تیری گدی بنی رہے۔ وہ بیچارا پہلے ہی پریشان ہوتا ہے اسی قسم کی دعائیں ایسی محسوس ہوتی ہیں جیسے وہ بڑھیا اس کا منہ چڑھا رہی ہو ایسے بھکاریوں کو عام طور پر گالی سننی پڑتی ہے۔

ہمارے نانبائی کی دوکان محض دودھ لسی کی دوکان نہیں بلکہ یہاں پر ہندوستان بھر کے قسم قسم کے بھکاری بھی دیکھے

جا سکتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کے ہتھکنڈے واقعی بہت موثر ہیں لیکن ان بھکاریوں کے لئے جو محض دعاؤں پر انحصار رکھتے ہیں باقاعدہ تعلیم و تربیت کا انتظام ہونا چاہئے۔ عقل و ذہانت کی تو ان میں کوئی کمی نہیں ہوتی صرف تنظیم اور تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کو موقع و محل کے مطابق دعائیں دینے کا سلیقہ سکھایا جانا چاہئے مثلاً کوئی لڑکا امتحان دے کر آیا ہو تو ظاہر ہے اسے زیادہ تر اسی بات کی تشویش ہوگی اگر اس وقت کوئی چرب زبان فقیر یہ دعا دے "اللہ تعالیٰ تجھے امتحان میں پاس کر دے" تو یہ لازمی بات ہے طالبعلم ضرور اسے کچھ نہ کچھ دے ڈالے گا۔ اس کو اور زیادہ تفصیل کے ساتھ سیکھا جا سکتا ہے۔ بھکاریوں کی تنظیم کر کے اس قسم کے شکار تاڑ لئے جائیں۔ اگر کوئی شخص کسی نوکری کے سلسلہ میں انٹرویو کر کے آیا ہو تو اسے دعا دی جائے کہ اللہ تجھے انٹرویو میں کامیاب کرے۔ اگر کوئی شخص کسی جگہ کو جا رہا ہو اور گاڑی چھوٹنے والی ہو تو اس کے لئے دعا کی جائے خدا کرے تیری گاڑی تجھے مل جائے۔ اگر کوئی شخص گھر کی طرف لپکا جا رہا ہو بادل گھر آئے ہوں بارش کا خطرہ ہو تو اسے دعا دی جائے کہ پرمیشور کرے تو بارش ہونے سے پہلے گھر پہنچ جائے۔ یا گھر پہنچنے سے پہلے پہلے بارش نہ ہو۔ اس قسم کی ہزاروں باتیں ہو سکتی ہیں جن میں دعاؤں سے کام لے کر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

یہ تو عام قسم کے بھکاری ہیں جو ہمارے نانبائی کی دکان پر

کھڑے رہتے ہیں اور عام طور پر نظر آ جاتے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ خاص قسم کے بھکاری بھی ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً ایک نہایت مکروہ صورت بھکاری کے بھیک مانگنے کا طریقہ سب سے نرالا ہے۔ اس کا رنگ گلے سڑے چمڑے کی مانند بھدا ہے۔ اس کی ناک بیٹھی ہوئی ہے۔ دانت آگے کو نکلے ہوئے اور بہت زیادہ غلیظ۔ وہ چیتھڑے سے لٹکائے رہتا ہے جن میں سے بہت سخت بو ہر طرف پھیلتی رہتی ہے۔ اس کے چہرے پر پسینہ کی بوندیں جھلکتی رہتی ہیں۔ پسینہ کے ساتھ اس کے چہرے پر خاص قسم کی چکنائی بھی ملی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس قدر گھناؤنا شخص ہے کہ انسان کا اس کی طرف دیکھنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ اس کا خیرات مانگنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ بغیر منہ سے آواز نکالے چپ چاپ کسی شخص کے سامنے دفعتاً ہی جا کھڑا ہوتا ہے اور پھر بڑھ کر بہت قریب چلا جاتا ہے اسکا منہ بھی انسان کے منہ کے بالکل قریب پہنچ جاتا ہے یہاں تک کہ اس کے دبے ہوئے نتھنوں میں سے نکلتی ہوئی ہوا ان کے چہرے کو چھوتی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہے وہ منہ سے کچھ نہیں کہتا بلکہ بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہاتھ آگے بڑھا دیتا ہے۔ ایسے موقع پر اس کے ہاتھ پر کچھ نہ کچھ رکھے بغیر جان نہیں چھوٹتی۔ بلکہ اور کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ اس سے اس قدر زیادہ گھن آتی ہے کہ انسان اسے دھکا دے کر پرے بھی نہیں ہٹا سکتا۔ یہ آنکھوں دیکھی بات ہے کہ ایک مرتبہ وہ کسی شخص کے سامنے حسب عادت دفعتاً ہی جا کھڑا ہوا۔ اس آدمی کو اس کی اس حرکت

پر بہت غصہ آیا۔ اس نے بڑی نفرت سے اسے پرے ہٹ جانے کے لئے کہا اور ساتھ ہی دو چار گالیاں بھی سُنا دیں۔ اس پر فقیر نے فی الفور اس کے منہ پر تھوک دیا........ اور پھر چشم زدن میں بھاگ کر گلی میں غائب ہو گیا۔

وہاں اس قسم کے بھکاری بھی آتے ہیں جو ایک طرف چپ چاپ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ کسی قسم کی بے چینی کا اظہار نہیں کرتے کسی کو کسی طریقہ سے بھی دق کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ نہ للچائی ہوئی نظروں سے کسی کے منہ کی طرف تکتے ہیں۔ نہ دعائیں دیتے ہیں وہ مزے سے سائے میں کھڑے رہتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک پنکھا ہوتا ہے۔ وہ ہر جانے والے کو پنکھا جھلتے رہتے ہیں اس کی فلاسفی خواہ کچھ بھی ہو لیکن یہ حربہ بھی بہت پُر اثر ہے۔ اگرچہ ان کی آمدنی اِدھر اُدھر مارے مارے پھرنے والے بھکاریوں سے کچھ کم ہی ہوتی ہے لیکن وہ کم از کم ایک مقام پر آرام سے کھڑے تو رہتے ہیں۔ اور نہ انھیں کڑدی کسیلی باتیں ہی سننی پڑتی ہے۔ انکی موجودگی کا علم اسی وقت ہوتا ہے جب انسان کو شدید گرمی کے موسم میں سرد ہوا کا احساس ہوتا ہے۔

ان فقیروں نے اپنی قابلیت کے اچھے اچھے ثبوت پیش کئے ہیں۔ اور وہ کسی نہ کسی ڈھنگ سے کچھ لے ہی مرتے ہیں۔ مثلاً ایک اندھا بھکاری آیا کرتا ہے۔ اور نانبائی کی دوکان کے قریب بیٹھ جاتا ہے۔ وہ بھی کسی خاص شخص کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اس کا روئے سخن سبھی کی طرف ہوتا ہے۔ اسکی آواز خوب بلند اور بھرپور ہے

ہے۔ وہ میٹھا پاٹ دار آواز میں ایک ہی فقرہ دہرایا کرتا ہے "ارے بابا پیاسا ہوں مجھے بھی لسی پلا دو۔ ارے بابا! پیاسا ہوں مجھے بھی لسی پلا دو" وہ بلند آواز میں چلائے جاتا ہے۔ اس کی آواز اِدھر اُدھر سب دُور کانوں تک گونج کر پہنچ جاتی ہے اسے بعض اوقات ایک یا ڈیڑھ گھنٹے تک اسی طرح بیٹھے رہنا پڑتا ہے۔ دھوپ کی گرمی میں اس کے سر اور گردن سے پسینہ چھوٹنے لگتا ہے لیکن وہ ایک ضدی بچے کی طرح چلائے جاتا ہے۔ یہاں تک کسی شخص کو رحم آجاتا ہے وہ اسے ایک گلاس لسی پلا دیتا ہے۔ اگر اُس سے کوئی پھر بھی کہے کہ بابا اور لسی پیو گے۔ تو وہ بلا کسی جھجک کے کہہ دیگا "بھگت! تمھاری ایسی شردھا تو سو بھی پی لیتے ہیں" اس طرح وہ بھگت کی کامنا پوری کرنے کے لئے ایک گلاس اور چڑھا جاتا ہے۔

جو لوگ وہاں آتے ہیں وہ ان فقیروں کے ہاتھوں بہت تنگ آتے ہیں۔ اِدھر وہ ان فقیروں سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں یہ گڑ کی مکھی کی طرح ان کے قریب بھنکتے رہتے ہیں۔ اور کئی طرح کی باتیں کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔

"بابا معاف کرو، مائی معاف کرو" یہ تو عام جوابات ہیں جو انھیں دیئے جاتے ہیں۔ لیکن ان اختلافات کے باوجود ان کی آپس میں کچھ یگانگی بھی ہوتی ہے۔ مثلاً یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک مائی کو کہا گیا کہ مائی معاف کرو تو وہ ناک چڑھا کر اور ہاتھ جھٹک کر کہتی ہے۔ "معاف کرو۔ معاف کرو۔ اگر ہم سب کو معاف کر دیا کریں تو پھر

کھائیں کہاں سے؟"

پھر وہ آدمی کہتا ہے "ساری بڑھیا ساری عمر کھاتی رہی ہو اب نہ کھاؤ گی تو کیا ہو جائے گا؟ اب دھرتی کا بوجھ کم کر دینا!"

اس پہ واقعی بڑھیا کو غصّہ آ جاتا ہے اور اگر اسی وقت اس کے ہاتھ پہ ایک پیسہ نہ رکھدیا جائے تو نہ جانے کیا سے کیا بک دے"۔

کوئی بھکارن بغل میں ایک بچّہ لئے آئے گی "بابو! گدی بنی رہے۔ بچّہ بھوکا ہے۔ کچھ کھایا نہیں کل سے"

اب وہ آدمی گھوم کر اس کی طرف بڑے غور سے دیکھے گا۔

"ہوں اچھا تو کس کا بچّہ ہے یہ ۔ ۔ ۔ ؟"

"میرا ہی ہے"

"تیرا ہے؟ ——— ایں؟ ——— تجھے بچّے دینے کے لئے کس نے کہا تھا"

بھکارن چپ رہتی ہے۔

"بتا کس نے کہا تھا بچّے دینے کو؟ ایں؟" وہ کچھ جھینپ جاتی ہے "بابو جی کسی کے کہنے سے تو بچے پیدا نہیں ہوتے نا؟"

"جی! اچھا تو صاحب پھر کیسے ہو جاتے ہیں یہ بچّے ذرا ہم بھی تو جانیں"

بھکارن چپ۔

"میں نے کہا بچّے پیدا کرنے سے پہلے ذرا ہم سے بھی تو آنکھ ملا لیا کرو۔ پھر دیکھو ہم کیا کیا مال کھلاتے ہیں تجھے اور تیرے بچّے کو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

بھکارن ان باتوں کی تو عادی ہوتی ہیں۔ "ہٹو بابو جی! آپ تو مزاخ کرتے ہیں اتنے بڑے آدمی ہو کر . . . . . ."

"اجی مجاخ، نہیں کرتا ہیں۔ میں تو سولہ آنے بات کہتا ہوں۔ اب تم ہی بتاؤ۔ بچے پیدا کریں دوسرے اور انھیں کھلائیں ہم۔ ان کے پاس جاؤ نا اور ان سے کہو کہ اب وہ تمہارے بچوں کو بھی کھلائیں۔"

بعض کمسن لڑکیاں، جن کے خدوخال کچھ تیکھے ہوتے ہیں اور جن کی جوانی بالکل ہی ابتدائی منزلوں میں ہوتی ہے اور جنھیں بازار کے بنواڑیوں اور چھابڑی والوں نے عجیب عجیب نظروں سے دیکھکر بگاڑ دیا ہوتا ہے کسی شخص کے قریب پہنچتی ہیں اور ہاتھ پھیلا کر کہتی ہے "ہے بابو گدی ہے رہے۔ کل سے بھوکی ہوں۔"

وہ آدمی اپنے دوست کو کہنی مار کر کہتا ہے۔ "دیکھا استاد! شگوفہ ہے شگوفہ . . . . . . کیوں ری کیا نام ہے تیرا؟"

پھر وہ لوگ للچائی ہوئی نظروں سے اس کی پھوٹتی جوانی کے چھوٹے ابھاروں پر نظر گاڑ دیتے ہیں۔ "کیوں ری کوئی لڑکا لڑکی نہیں جنا تو نے۔ کیوں شرماتی ہے۔ تو تو ڈھیر کے ڈھیر بچے دے گی۔" لڑکی شرماکر ناز و ادا دکھاتی ہوئی کھڑی رہتی ہے "بابو جوانی بنی رہے . . . ."

اس پر بابو صاحب خوب اینڈ کر لوفروں کے لہجے میں کہتے ہیں "اری! میری جوانی بنی رہنے سے تجھے کیا فائدہ ہوگا۔"

پھر وہ پیسہ دیتے وقت لڑکی کا ہاتھ کو چھو لیتا۔ "ادھر آیا کر دنا ہماری دوکان کے پچھواڑے . . . . ہماری بات سن لے

کہ جو ئی مل گیا اُستاد ہم سا، تو یاد رکھیو پھر بڑے بڑے سیٹھ روپیوں کی تھیلیاں لئے پھر تیرے پاس آیا کریں گے"۔
اِدھر اُدھر کے کچھ لوگ یہ باتیں سُن کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ وہ خوب دانت نکال نکال کر خوب ہنستے ہیں اور بعض منہ بنا کر رُخ پھیر لیتے ہیں۔
ان میں کوئی جنٹلمین پتلون کی کریز درست کرتے ہوئے کہتے ہیں "ارے صاحب! یہ بھکاری بھی عجب لعنت ہیں۔ جہاں دیکھو پلنگ کے چوہوں کی طرح انسان کا پیچھا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ انھیں ذرا شرم نہیں آتی۔ اجی قصور سماج کا ہے جو انھیں درست کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا۔ کسی غیر ملک میں کوئی شخص آپ کو بھیک مانگتا ہوا نہیں دکھائی دیگا وہاں یہ باتیں سرکاری طور پہ منع ہیں اگر کوئی اسطرح کرے بھی تو اسے جیل میں ڈال دیا جاتا ہے قانون سخت سے سخت سزا دیتا ہے۔ یہ لوگ انسانیت کے نام پہ دھبّہ ہیں۔ نہ معلوم چیونٹیوں کی طرح کہاں سے نکل آتے ہیں۔ اگر آپ ابھی یہاں کھانا تقسیم کیجیئے تو ہزاروں بھکاری اکٹھا ہو جائیں گے۔ روٹی کی تو انھیں بیس بیس میل سے بو آ جاتی ہے ....."
کوئی اور صاحب کہتے ہیں "اجی آپ کو معلوم نہیں کہ دہلی میں کیا ہو رہا ہے"۔
سب یہ جاننے کے لئے کہ دہلی میں کیا ہو رہا ہے ان کے منہ کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔
"جی وہاں سب بھکاریوں کو جمع کر کے ایک خاص جگہ پر رکھا جاتا ہے

ان سے ہر قسم کا کام لیا جاتا ہے۔ چھوٹی موٹی چیزیں بنوائی جاتی ہیں اور پھر انھیں بیچ دیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ لوگ خود اپنی کمائی سے روٹی کھاتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی بازار میں بھیک مانگتا ہوا دکھائی دے تو اُسے بڑی سخت سزا دی جاتی ہے۔ اور اگر وہ شخص اس سزا کے باوجود بھی بھیک مانگنے سے باز نہ آئے تو پھر اُسے گولی سے اُڑا دیا جاتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ چاروں طرف داد طلب نظروں سے دیکھتے ہیں۔۔۔۔۔۔

اتنے میں ایک اور سادھو وہاں آنکلتا ہے۔ اِس سادھو کو آج تک بھیک مانگتے کسی نے نہیں دیکھا۔ نہ معلوم وہ کہاں سے کھاتا کیسے گزارا کرتا ہے بس جب دیکھو ہنستا رہتا ہے۔ اس کے سر پر لمبی لمبی جٹائیں ہیں جو پیٹھ پر لٹکی رہتی ہیں۔ اُس نے ڈاڑھی بھی چھوڑ رکھی ہے۔ ڈاڑھی بہت بڑی نہیں۔ اس کا چہرہ اور ڈاڑھی گرد میں اٹے رہتے ہیں اُس کے جسم پر صرف کمر سے ایک کپڑا لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ پاؤں میں گھنگھرو بندھے ہوتے ہیں۔ ایک ہاتھ میں لوہے کی ایک لمبی سلاخ ہوتی ہے جو ایک سرے پر خوب تیز ہوتی ہے۔ اور دوسرے ہاتھ میں آٹھ دس انگل لمبی ایک بنسری۔ وہ اس بنسری سے صرف ایک ہی سر نکالتا ہے۔ جب دیکھو وہی ایک دھن بجائی جا رہی ہے۔ وہ چوک میں پہنچتا ہے تو بنسری منہ سے لگا کر ناچنے لگتا ہے۔ بنسری کی دُھن بھی بڑی دلکش ہوتی ہے۔ اِس کے ساتھ اُس کا سیدھا سادا رقص بھی خوب مزا دے جاتا ہے۔ لوگ تماشہ دیکھنے کے لئے اس کے گرد گھیرا ڈال لیتے ہیں۔ وہ دیر تک رقص کرتا رہتا ہے۔ آخر کار جب وہ تھک جاتا ہے تو ناچ ختم کر دیتا ہے اور جھک جھک کر سب کو آداب عرض کرتا ہے۔ اگر کوئی اُسے پیسہ دینا چاہے تو انکار کر دیتا ہے اور ہنس کر کہتا ہے "نا بابا! ہم بھکیروں کو مایا جال میں مت پھنساؤ۔"

اُس کی یہ بے نیازی دیکھ کر کئی لوگوں کے شردھا کے مارے سر جھک جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اِس گھور کلجگ میں بھی ایشور کے اصلی بھگتوں کی کچھ کمی نہیں لیکن کوئی مادہ پرست سوچنے لگتا ہے کہ آخر یہ کھاتا کہاں سے ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ لیکن بہتوں کا خیال یہ ہے کہ وہ سرکاری جاسوس ہے۔

میں تو اِن بھکاریوں کی لیاقت کا قائل ہو چکا ہوں۔ اِن میں بعض بڑے بڑے فلاسفر بھی ہوتے ہیں۔ ایسی دل لگتی کہتے ہیں کہ انسان سُن کر دنگ رہ جاتا ہے۔ مثلاً ایک دن علی الصبح لسّی پینے کے لئے دُکان پر گیا اور لوگ بھی کھڑے تھے اتنے میں ایک بھکاری نے کاسۂ گدائی آگے بڑھا دیا۔

ایک صاحب نے چلا کر کہا "ابے تم کبھی جان بھی چھوڑو گے۔ اِدھر سورج نکلا اور اِدھر یہ پیالہ لے کر مانگنے چل کھڑے ہوئے۔ آسان کام ہے نا۔ کیوں بے شرم نہیں آتی...... مانگنا بھی کوئی کام ہے۔ ایں؟"

سب لوگ بھکاری کی طرف دیکھنے لگے جس کی آنکھوں میں ایک گہری اُداسی جھلک رہی تھی۔ اُس نے کاسہ آگے بڑھا کر بڑی سنجیدہ اور پُر اثر آواز میں جواب دیا۔ "بابا! اگر یہ کام اتنا ہی آسان ہے تو لو یہ پیالہ ایک دن بھیک مانگ کر دکھاؤ۔"

فراق گورکھپوری کی تازہ تصنیفات

اُردو ادبیاتِ عالیہ میں گرانبہا اضافہ

رُوپ

جمالیاتی رباعیوں کا ضخیم مجموعہ۔ سنگار رس کی ان رباعیوں میں انسانی حسن یا کسی شیش محل میں بیشمار جھلکیاں دکھا رہا ہے "آئینہ در آئینہ ہے یہ بزمِ جاں" جمالیاتی مفکرانہ اور روحانی شاعری کی بلندیاں چھولی ہیں۔ پانچ نہایت قیمتی تصویروں کے ساتھ قیمت فی جلد ساڑھے چار روپئے۔ قسم خاص فی جلد پانچ روپیہ آٹھ آنہ

شبنمستاں

فراق کی شاہکارانہ غزلوں کا مجموعہ۔ پانچ سو بارہ (۵۱۲) صفحات۔ عشقیہ شاعری کتنی پُرعظمت ہو سکتی ہے۔ تصوف اور عرفانیات کا سہارا لئے بغیر اگر اس کا اندازہ کرنا ہو تو شبنمستاں پڑھئے اور اسی کے نغمۂ سرمدی کو اپنی روح میں ڈوب جانے دیجئے۔ یہ کتاب عہد آفریں ہے۔ قیمت فی جلد چھ روپیہ۔

مشعل

فراق کی منتخب غزلوں، نظموں، رباعیوں اور مفرد اشعار کے آبگینوں کا رنگارنگ مجموعہ۔ یہ کتاب پڑھ کر بیک نظر آپ فراق کی شاعری کے وہ اہم پہلو دیکھ لیں گے جن میں شعلوں کی جگمگاہٹ ہے۔ اور کافور کی ٹھنڈک ہے۔ فی جلد دو روپیہ بارہ آنہ

روحِ کائنات

فراق کی تمام مسلسل نظموں کا مجموعہ ہے اور ہمارے زمانہ کے بہت بڑے دماغ کی عکس ریزی ہر نظم میں ہوتی ہے۔ پہلے اڈیشن کی بہت تھوڑی کاپیاں بچی ہیں۔ دوسرا اڈیشن زیر طبع ہے۔ ان نظموں کو نسخہ ہائے کیمیا کہا جائے تو بجا ہے۔ دنیا کس بحرانی دور سے گزر رہی ہے یہ نظمیں اس کا اندازہ کرا دیتی ہیں ـــــ ہ

آج دو جگ مل رہے ہیں کاٹتی ہیں پے بہ پنے
پاس کی پرچھائیوں کو دُور کی پرچھائیاں

فی جلد ساڑھے چار روپے۔

رمز و کنایات

فراق کی غیر مطبوعہ غزلوں کا نیا مجموعہ۔ پرخلوص محبت۔ نازک تخیل۔ رنگینی۔ نغگی۔ پریم کے رس سے بوجھل کیفیتیں، لطیف اشاریت۔ چابکدست فن کاری۔ معصومی و پُرکاری۔ شرافتِ جذبات۔ شدتِ احساس اور نرمیِ آواز کی بہترین مثالیں دیکھنی ہوں تو رمز و کنایات دیکھیے۔ فی جلد تین ۳ روپیہ

اُردو کی عشقیہ شاعری

گزشتہ چوتھائی صدی سے فراق گورکھپوری کے ادبی کارنامے ہمارے سامنے ہیں۔ یہ کتاب فراق کے سلسلۂ نثر و نظم کی ایک اہم کڑی ہے اسے پڑھ کر یہی نہیں کہ ہم حسن و عشق کی رمزیت میں ڈوب جاتے ہیں بلکہ ان صفحات میں خود فراق کی شخصیت ہم پر آئینہ ہو جاتی ہے۔ فراق کی شہرت کو اب اتنا فروغ ہو چکا ہے کہ اب فراق کی شاعری اور فراق کی نثر کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ قیمت فی جلد دو ۲ روپیہ بارہ ۱۲ آنہ

انداز ے

اُردو ادب کی تنقید میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ ہر شاعر کے کلام کی صوتیات کے

لہراتے ہوئے آئینہ میں اس کی شاعرانہ شخصیت اُس کے وجدان اور اس کے مخصوص نفسیات کی جھلک دکھائی گئی ہے۔ یہ مقالے مغربی اور مشرقی قدیم اور جدید کلاسکی اور رومانی اصولِ تنقید کے بہترین امتزاج اور ہم آہنگی کی مثال ہیں۔ فراقؔ گورکھپوری کی وسعتِ نظر اور اُن کا مخصوص اسلوبِ بیان نثرِ اُردو کے نئے امکانات کا پتہ دیتا ہے۔

فی جلد چار روپیہ۔

ہماری دیگر مطبوعات

افسانہ کہ حقیقت؟

ظفر واسطی کا نام دورِ حاضر کے مشہور و مقبول ترین افسانہ نگاروں میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ظفر واسطی کے افسانوں کا یہ تازہ مجموعہ شروع سے اخیر تک اتنا دلچسپ ہے کہ آپ ہر صفحہ میں محو ہو جائیں گے۔ فی جلد دو روپیہ چار آنہ

دل کا بوجھ

ظفر واسطی کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ — زیرِ طبع ہے۔

دِل سے قریب

انتصار نیوتنوی دَورِ حاضر کے لکھنے والوں میں ایک مخصوص طرزِ نگارش کے مالک ہیں

د

ان کے ناٹکوں کا یہ لاجواب مجموعہ تمام ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہو چکا ہے۔ عے/

آدمی

ارنسٹ ٹالر وہ مشہور جرمن ڈرامہ نگار ہے جس کے ڈرامے حکومت کے لئے اتنے خطرناک ثابت ہوئے کہ ہٹلر نے اُسے جلا وطن کر دیا۔ ٹالر کا نام دنیا بھر کے بڑے سے بڑے ڈرامہ نگاروں کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ آدمی ٹالر کے بہت مشہور ڈرامہ کا اُردو ترجمہ ہے جسے نسیم الہ آبادی نے کیا ہے۔ فی جلد ایک روپیہ آٹھ آنہ۔

مندرجہ ذیل کتابیں بھی ہم سے طلب فرمائیں۔

ٹوٹے ہوئے تار — از فاروق لطیفی — فی جلد ایک روپیہ آٹھ آنہ

رہس اور دیگر ریڈیائی ڈرامے۔ از اویس احمد ادیب۔ فی جلد دو روپیہ آٹھ آنہ

زخم و مرہم — از شعلہ وارثی — فی جلد دو روپیہ۔

سرمایہ داری — از سالک ہاشمی — فی جلد تین روپیہ۔

آنچل — از بیگم عالم عثمانی — فی جلد دو روپیہ

اقبال (اجمالی تبصرہ) از مجنوں گورکھپوری فی جلد ایک روپیہ بارہ آنہ۔

چراغ کا بجھنا اور دوسرے افسانے۔ بلونت سنگھ۔ فراق گورکھپوری — نسیم الہ آبادی۔ ظفر واسطی۔ انتصار نیوتنوی کے چیدہ افسانوں کا مجموعہ۔
قیمت فی جلد ایک روپیہ آٹھ آنہ

نوٹ

ہم سے براہِ راست وی۔پی کے ذریعہ سے اگر پانچ روپیہ یا اس
کی کتابوں کا آرڈر دیں گے تو ڈاک محصول معاف۔